ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
فروری 2024ء
اشاعت کا اکیاسی واں سال

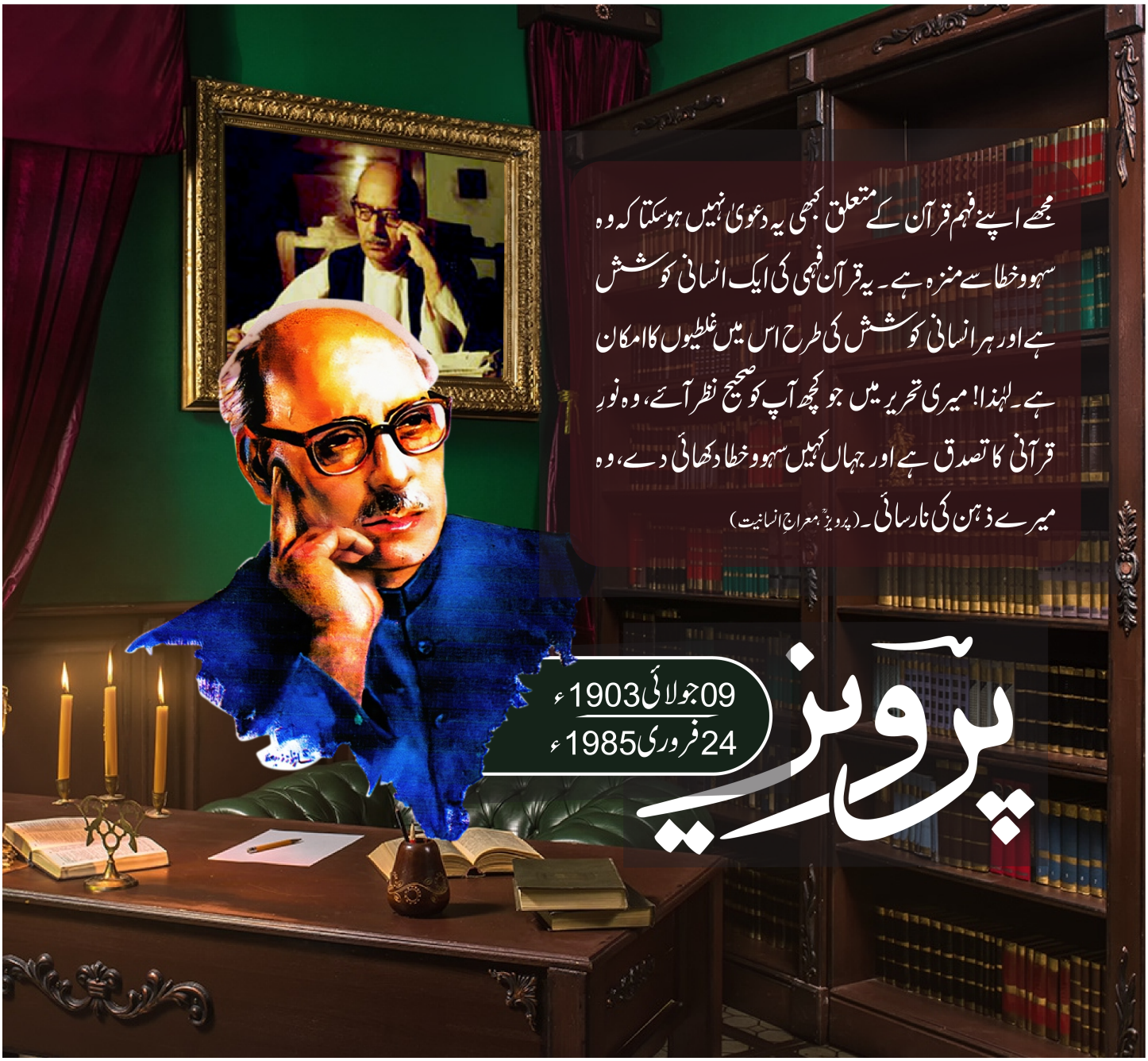
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویزؒ، معراجِ انسانیت)

پرویز

09 جولائی 1903ء
24 فروری 1985ء



پرویز صاحبؒ درسِ قرآنِ کریم کے لئے تشریف لا رہے ہیں



رفقاءِ عمرہ کے ہمراہ جبلِ نور کے دامن میں 1982ء

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
فروری 2024ء

جلد 77 | شمارہ نمبر 2

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
معات: غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ (سوانحی خاکہ)	ادارہ	4
پھول جو میں نے چنے	سید امتیاز احمد	6
قائدِ اعظمؒ کا خط بنام پرویز علیہ الرحمۃ	ادارہ	17
جنرل محمد ضیاء الحق کا تعزیت نامہ	ادارہ	17
پرویزؒ صاحب کا پیغام (اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام)	مرتبہ: محمد اکرم راٹھور	18
بیادِ غلام احمد پرویزؒ	عبدالعزیز خالد	53
ووٹ کس کو دیا جائے؟	ادارہ	54
محشرستانِ فلسطین	ادارہ	58

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

سوانحی خاکہ

پورا نام غلام احمد پرویز اور والد کا نام چوہدری فضل دین تھا۔ متحدہ ہندوستان کے معروف شہر بٹالہ (ضلع گورداسپور) کے ایک سنی حنفی گھرانے میں 9 جولائی 1903ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جان حکیم مولوی رحیم بخش اپنے وقت کے مانے ہوئے صوفی بزرگ تھے اور چشتیہ نظامیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔

پرویز صاحب نے قرآن اور مذہبی علوم کی ابتدائی تعلیم اپنے دادا جان سے حاصل کی۔ اس زمانے میں شہر بٹالہ کی جامع مسجد کے خطیب مولانا محمد ابراہیم اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا ظفر الحق کے علم و ذہانت کا بڑا شہرہ تھا اور یہ دونوں، جید بزرگ تسلیم کئے جاتے تھے۔ چنانچہ پرویز صاحب کو مزید تربیت و تعلیم کے لئے ان کی شاگردی میں دے دیا گیا۔

''A Lady of England'' ہائی سکول بٹالہ سے 1921ء میں میٹرک پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1934ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1927ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے مرکزی سیکرٹریٹ میں ملازمت اختیار کی اور بہت جلد ترقی پا کر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں اہم عہدہ پر فائز ہوئے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں (قیامِ لاہور کے عرصہ میں) مفکرِ پاکستان علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، کے قریب ہوئے جنہوں نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے شعورِ پرویز کو دینِ اسلام اور فہمِ قرآن کی بے مثال و لازوال جہتوں سے آگاہ و آشنا کیا۔ یہ علامہ اقبال کا ہی فیضانِ نظر تھا کہ پرویز صاحب نہ صرف قرآن کے سانچے میں ڈھلتے گئے بلکہ تحریکِ پاکستان کے پیکر میں ایک سرگرم و فعال روح بن کر اتر گئے۔

علامہ اقبال ہی کے ایماء پر پرویز صاحب حافظ محمد اسلم جیراجپوری سے ملے۔ حافظ صاحب برصغیر پاک و ہند کے زبردست عالم اور مسلم سکالر تھے۔ حافظ صاحب کی علمی شخصیت، مرتبت اور اہمیت کا اندازہ اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ ان کے اس حد تک معترف تھے کہ جنابِ پرویز کو عربی زبان و علوم سیکھنے کے لیے ان کی خدمت میں بھیجا تھا، جن کی رفاقت و محبت نے پرویز صاحب کو بہت کچھ عطا کیا۔

مقدمۂ مرزائیہ بہاول پور 1935ء کا عدالتی فیصلہ پرویز صاحب کے مضمون کا مرہون منت ہے۔ اس فیصلہ کی رُو سے تاریخ میں پہلی بار قانون کی عدالت سے مرزائیوں کے خلاف غیر مسلم ہونے کا فیصلہ آیا۔ اس فیصلہ کے متن میں فاضل جج نے پرویز علیہ الرحمہ کی بیان کی ہوئی ''نبی'' کی تعریف کو بنیاد بنا کر فیصلہ تحریر کیا جس کے لئے اس فیصلہ کے متن میں پرویز صاحب

کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

تحریکِ پاکستان کے دَوران پرویز صاحب قائداعظم محمد علی جناح کے پرائیویٹ دینی مشیر رہے اور قائداعظم کو خالص قرآنی اور دینی اقدار اور اصولوں سے آگاہ و آشنا کرتے رہے۔ قائداعظم سے اُن کا تعارف بھی علامہ اقبالؒ کے ذریعہ سے ہی ہوا تھا۔

1938ء میں علامہ اقبالؒ کے مشورہ اور قائداعظم محمد علی جناح کی ہدایت پر ماہنامہ ''طلوعِ اسلام'' کی ادارت سنبھالی۔ ان کے زیرِ انتظام پہلا شمارہ اپریل 1938ء میں علامہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور ان کی نظر سے گزرا تھا۔

(ہفت روزہ نظریۂ پاکستان' لائل پور 1973ء بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ 1990ء)

قیامِ پاکستان کے فوری بعد پاکستان (کراچی) آ گئے اور حکومتِ پاکستان کے مرکزی سیکرٹریٹ میں اسی عہدہ پر فائز ہوئے جس پر دہلی (انڈیا) میں فائز تھے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ؒ' جو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بھی تھے' نے بہت چاہا کہ علامہ غلام احمد پرویز جو چاہیں اپنی مرضی کی وزارت قبول کر لیں یا طلوعِ اسلام، کے لئے سرکاری گرانٹ لے لیں لیکن علامہ علیہ الرحمۃ نے بصد شکریہ کسی بھی قسم کی امداد، گرانٹ اور عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ موصوف فکرِ قرآنی اور اس فکر کی وسیع بنیادوں پر نشر و اشاعت اور قرآنی نہج پر نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت کے لئے خود کو وقف کر چکے تھے اور ہمہ تن اسی میں منہمک رہنے لگے تھے۔ چنانچہ 1955ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اور مکمل آزادی کے ساتھ تحریکِ فکرِ قرآنی کو آگے بڑھانے اور پھیلانے لگے۔

1953ء میں کراچی کی سرکاری رہائش گاہ سے درسِ قرآنِ کریم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ 1958ء میں وہ لاہور منتقل ہوئے اور ہفت روزہ قرآنی درس کا ازسرِ نو آغاز کیا۔ 1967ء کے اختتام تک پورے قرآنِ پاک کے مطالب و مفاہیم، ہفت روزہ درسوں کے ذریعہ سے سامعین کے ذہن نشین کرا چکے تھے اور دوسرا دور جاری تھا کہ چوبیس فروری 1985ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

پرویز صاحب کی وفات کے بعد ان کی رہائش گاہ بمقام 25 بی گلبرگ 2 لاہور میں ہی طلوعِ اسلام ٹرسٹ اور ادارہ طلوعِ اسلام کے دفاتر کو مستقل کر دیا گیا۔

علامہ غلام احمد پرویز نے کوئی اولاد پیچھے نہیں چھوڑی لیکن ان کا مشن، بذاتِ خود ایسی یادگار ہے جو ان کے نام اور کام کو قیامت تک تابندہ و پائندہ رکھے گا۔ اس مشن کی تکمیل میں جو ادارے شب و روز، مصروفِ عمل ہیں ان میں، دنیا بھر میں پھیلی ہوئی طلوعِ اسلام کی بزموں کے علاوہ ماہنامہ طلوعِ اسلام، ادارہ طلوعِ اسلام، طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔ دی پرویز میموریل (ریسرچ سکالرز) لائبریری' اَن گنت ویڈیو اور آڈیو قرآنی دروس، سینکڑوں کی تعداد میں پمفلٹس اور ان کی تصنیف کردہ کتب کا ذخیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

پرویز صاحب نے قرآن کیسے سمجھا یا ان کے دلوں پر نقش ہے جنہوں نے پرویز صاحب کے وہ درس سنے ہیں جو ہر جمعہ کو 25 بی گلبرگ لاہور میں ہوا کرتے تھے اور ان کی وفات کے بعد بذریعہ ویڈیو اب بھی جاری و ساری ہیں۔

وہ شمع بجھ گئی' مگر اس کے فروغ سے قندیلِ آرزو ہے' فروزاں اسی طرح

سید امتیاز احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پھول جو میں نے چنے

نظامِ ربوبیتؑ سے ماخوذ

سلسلۂ کائنات کی تمام ہنگامہ آرائیاں، اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود کرنے کے لئے ہیں۔

انقلاب، قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے مقاصد کے مظاہرہ کا نام ہے نہ کہ محض خارج میں فساد برپا کر دینے کا۔

قوموں کی ہلاکت و بربادی کی یہی شکل نہیں ہوتی کہ وہ قوم طبعی طور پر فنا کر دی جائے اور صفحہ ارض پر اس کا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ رہے۔ تباہی کی بدترین شکل یہ ہے کہ وہ قوم طبعی طور پر تو زندہ رہے لیکن اس کا شمار مردہ قوموں میں ہو۔

نفسِ انسانی کی تربیت کا راز دینے میں ہے۔ یعنی اس میں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کس حد تک نوع انسانی کی عالمگیر ربوبیت اور حسنِ کائنات میں اضافہ کے لئے وقف کرتا ہے۔

یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کس قسم کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ تم زندگی ایک نہج کی بسر کرو اور اس کے نتائج دوسری قسم کے برآمد ہو جائیں۔

اس کائنات میں ایک ہی قانون ہے جو انفس اور آفاق کی دنیا میں کارفرما ہے یعنی وہی قانون ربوبیت جو خارجی کائنات میں از خود نافذ العمل ہے اسے انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہونا چاہئے۔

مفاد خویش کے نظریہ کے ماتحت دنیاوی زیست کا سامان لہو ولعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ حقیقی زندگی اسی نظریے سے حاصل ہوسکتی ہے جس میں نگاہ مستقبل اور پوری انسانیت پر رہے۔

انسانوں کی دنیا میں اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس سے خالص ابلیسی معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے.....لیکن اگر اسی عقل کو وحی کے تابع رکھا جائے تو جنتی معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے۔

جب معاشرہ میں ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بغیر حقوق کے تقاضے بلند ہونے شروع ہو جائیں تو اس کا نتیجہ انتشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جو قوم اپنے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہے خود ان کی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور چونکہ زندگی کا دارومدار توازن اور اعتدال پر ہے۔ اس لئے اس عدم توازن سے ان کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں سے ماخوذ:

قرآن کا پیغام شرفِ انسانیت کا پیغام اور اس کی دعوت احترامِ آدمیت کی دعوت ہے۔

انسان بحیثیت انسان واجب التکریم ہے۔ اس کا انسان ہونا اس کے لئے باعثِ شرف ہے اور یہ شرف و تکریم ہر فرزندِ آدم کے لئے ہے۔

یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے وہ منزل من اللہ، تنقید کی حد سے بالا ہے۔۔۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے چلے جانا چاہئے۔ یہی اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔

کفر ہو یا ایمان، اس کا تعلق اعماقِ قلب سے ہے یہ اقرار جب تک دل کی گہرائیوں سے نہیں پھوٹتا اقرار کہلا ہی نہیں سکتا۔

اگر کہنے والا اپنے دعوے کے ثبوت میں عربی کے چار فقرے پیش کر کے انہیں حدیث، صحابہؓ کے فیصلے اور ائمہ فقہاؒ کی رائے قرار دے دے تو کیا اس کے قول کو محض اس لئے دین مان لیا جائے گا کہ اس نے عربی کے ان فقروں کی نسبت حضور رسالت مآب ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ فقہاؒ کی جانب کر دی ہے اور ایسا کرنے میں قطعاً نہیں شرمایا؟

کفر و ایمان کے معاملے میں جور و استبداد انسانیت کے خلاف بدترین جرم ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس باب میں

انسان کو اختیار وارادہ دیا ہے۔ اب اس اختیار وارادہ کو سلب کر لینا' خدا کے فیصلے کے خلاف کھلی بغاوت اور شرف آدمیت کا سلب ونہب ہے۔

جس طرح ذہنِ انسانی کے عہد طفولیت میں پیشوائیت نے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا تھا اور ان کے نام پہ سب کچھ روا رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح عہدِ جدید میں اسٹیٹ کے وجود کا بت تراشا گیا ہے۔ صرف الفاظ بدلے ہیں روح وہی ہے۔

اسلام یقیناً اپنے نظام کا تحفظ چاہتا ہے لیکن اس کے تحفظ کی قوت کا راز افرادِ ملت کے ایمانِ محکم میں ہوتا ہے جو دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کو زبردستی ملت کے ساتھ باندھ کر رکھا جائے ان کا وجود نظام کے استحکام کی بجائے اس کی سخت کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم نے قدم قدم پہ تدبر وتفکر اور تحقیق وتدقیق کی تائید کی ہے۔ اس سے قرآنی حقائق ہر زمانے میں بے نقاب ہوتے تھے۔۔۔ لیکن جب اربابِ مذہب نے حکم صادر کر دیا کہ جو شخص کوئی ایسی بات کہے جو ان کے عقیدے کے خلاف ہو اسے مرتد قرار دے دیا جائے گا تو قرآن پہ تفکر وتدبر کا دروازہ بند ہو گیا اور امت کے ذہن پر تقلید جامد کے تالے پڑ گئے۔

اسلام کی راہ کامرانیوں اور شادکامیوں کی راہ ہے اور کفر کی راہ ناکامیوں اور تباہیوں کی راہ۔ یہ اسلام پر قائم رہتے تو کامران وکامیاب زندگی بسر کرتے۔ انہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی تو ان کی کامیابیاں ناکامیوں میں بدل گئیں۔۔۔

جو بات قرآن کے خلاف ہے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ صرف قرآن ہم تک محفوظ پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی حفاظت کا ذمہ اس (اللہ) نے نہیں لیا۔

ملا کو اس سے کیا غرض کہ قرآن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ اس کا دین روایات پرستی ہے۔ وہ پرستش ہی اشخاص کی کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے معبودوں کی سلامتی چاہتا ہے۔ خواہ اس میں خدا باقی رہے یا نہ رہے۔

صدمہ اس کا نہیں کہ عجم کے منافقین نے روایات سازی سے نبی اکرم ﷺ کی سیرت کو کس طرح مسخ کر دیا۔ صدمہ اس کا ہے کہ آج ہمارا ملا کس طمطراق سے ان روایات کو دین بنا کر پیش کئے جا رہا ہے۔۔۔ دنیا انہی باتوں کو مستند قرار دے کر اچھال رہی ہے اور اسلام کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

اگر کوئی چیز خدا کے قانون کے خلاف ہے تو اسے خواہ ساری دنیا کی اقوام بطور قانون اختیار کر لیں ایک مسلمان کے نزدیک وہ باطل ہی رہے گی۔ حق نہیں قرار پا جائے گی۔

ملوکیت نے انسانی جسم کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنوائیں اور پیشوائیت نے انسانی ذہن کی جکڑ بندیوں کے لئے عقیدے وارادت کے دامِ ہمرنگِ زمیں تیار کئے۔ ان دونوں کے باہمی سمجھوتے نے راجہ کو ایشور کا اوتار، بادشاہ کو ظل اللہ اور کنگ کو حقوق خداوندی کا حامل بنا دیا۔

انسانی زندگی کے لئے صحیح معاشرہ وہی ہے جو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ چونکہ اس معاشرے کی بنیاد ہی ایمان پر ہے اور ایمان صرف اس وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب وہ دل کی رضامندی سے قبول کیا جائے۔ اس لئے اس معاشرے میں جبر واکراہ کا تصور ہی ناممکن ہے۔

اسلامی نظام اور قرآنی سٹیٹ میں جور وتغلب اور جبر واکراہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ اسٹیٹ ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو اس راہ میں سر جھکانے سے پہلے دل جھکا چکے ہوتے ہیں۔

اسبابِ زوالِ اُمت سے ماخوذ

جو قوم تسخیرِ فطرت نہیں کرتی اس کے لئے وحی کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسے مقامِ آدمیت بھی نصیب نہیں اسے مقامِ مومن کس طرح نصیب ہو سکتا ہے۔

جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے اسے اس کے صحیح مقام پر رکھ کر دیکھئے، اس کا نتیجہ ہدایت ہوگا لیکن اسے اس کے مقام سے ہٹا کر اپنے معتقدات اور نظریات کے تابع رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ گمراہی ہوگا۔ مسلمان کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔

مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر وندرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی برقرار نہ رہے..... تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔

حیاتِ انسانی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے..... یہ ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے بڑھتی ہوئی آخرت تک مسلسل

چلی جاتی ہے۔ زمان کی صراطِ مستقیم پر مختلف نشانات' گز پر کرہوں کے نشانات ہیں اور بس۔

ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو' خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعوے دار بھی ٹھوڑی ٹھوڑی تک اسی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے اور زبان سے ہم میں سے ہر شخص دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔

دین کے ارکان و مناسک اسی غیر مرئی حقیقت کو محسوس و مشہود شکل میں لانے کے ذرائع و اسباب تھے جن سے اس نظامِ زندگی کو عملاً متشکل ہونا تھا جسے اس نے ''الدین'' کہہ کر پکارا ہے۔

کائنات میں ہر شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی سبب سے آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقاء جاری و ساری ہے۔

اگر اشتراکیت کے معاشی نظام کے بعض اجزاء اسلام کے معاشی نظام کے بعض اجزاء سے ملتے ہیں تو اس سے اشتراکیت اور اسلام ایک نہیں ہو جاتے۔ ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے' ایسا بُعد کہ نہ کوئی اشتراکی مسلمان ہو سکتا ہے نہ کوئی مسلمان اشتراکی۔

تقلید سے انسان کی نگاہ ایسی غلط انداز ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی' اسے مارِ سیاہ بن کر دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔

انسانی صلاحیتوں کی نشوونما' انسانی معاشرہ سے الگ ہو کر زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کے چلوں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتی ہے انسانی معاشرہ کے اندر' معاشرتی زندگی میں۔

صدیوں کی تقلید سے مسلمانوں کا ذہن مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کے غاروں کی طرح تاریک ہو چکا ہے۔ جس

میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پا سکتی۔

حال کے پیش پا افتادہ مفاد بالکل ابھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں۔ لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں لہٰذا مستقبل کے مفاد کے لئے وہی کوشش کرے گا جسے اس کوشش کے اَن دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔

''شاہکار رسالت'' سے ماخوذ:

جب تک مسلمانوں کی فکر و نظر کا محور اور اعمال و افعال کا مرکز قرآن مجید رہے گا یہ صحیح راستے سے نہیں بھٹکیں گے۔ اگر انہوں نے اسے چھوڑ کر انسانی خیالات و نظریات کو اپنے لئے وجہِ کشش قرار دے لیا تو پھر انہیں تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

انسانی خیالات و نظریات کا علم حاصل کرنا اس شخص کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو انکا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے کر سکنے کے قابل ہو۔ جسے اس قدر صلاحیت حاصل نہ ہو وہ غلط اور صحیح اور حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکے گا۔

تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاھد ہے کہ قوموں کی کشتی شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ شخصیت پرستی دنیاوی حکمرانوں کو ظل اللہ علی الارض قرار دینے کی شکل میں ہو اور خواہ ''روحانی پیشواؤں'' کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔

دین کا تمام تر مدار یقین پر ہے۔ یقین اس امر کا جس بات کو ہم دین کہتے ہیں وہ بلا شک و شبہ خدا کی طرف سے ہے۔ اگر اس بنیاد میں ذرا سا بھی تزلزل واقع ہو جائے تو دین کی ساری عمارت نیچے آ گرتی ہے۔

خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت کا مقصد انسانوں تک صحیح تعلیم کا پہنچا دینا ہی نہیں تھا' اس کی غایت یہ تھی کہ انسانی زندگی کے انفرادی' اور اجتماعی ہر گوشے میں خوشگوار انقلاب پیدا کر کے کاروان انسانیت کو صحیح راستے پر گامزن کر دیا جائے تا کہ اس طرح زندگی رفتہ رفتہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

انسان کے سامنے دو ممکنات (Possibilities) ہوتی ہیں اور اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے اختیار کر لے۔ ان ممکنات کو تقدیرات الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ تقدیرات اٹل ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے

کی حد تک انسان صاحب اختیار ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی بنا پر اپنے فیصلوں اور اعمال کا ذمہ دار۔

مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا کے متعین فرمودہ مقصد کے حصول کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور دنیاوی مفاد و متاع کی جس قدر جاذبیتیں اور اور لذائذ و حظائظ کی جس قدر دلکشیاں اس کی دامن کش اور عناں گیر ہوں انہیں جھٹک کر الگ کر دے۔ راستے میں جس قدر مشکلات و خطرات سامنے آئیں ان کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس میں موت آ جائے تو بھی اس کی خوش نصیبی اور منزل مقصود تک زندہ پہنچ جائے تو بھی بیدار بختی۔

قرآن کریم کی رو سے انسان کا امتیازی شرف جس سے وہ حیوانات سے متمیز اور مختص ہوتا ہے اس کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ اسی سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور اس کی یہی ذمہ داری اسے جزا یا سزا کا مستوجب بناتی ہے۔

ایمان قلب و دماغ کی کامل، بلا جور و اکراہ رضامندی سے صداقت کو قبول کرنے کا نام ہے اور جب تک کوئی شخص اس صداقت کو اس طرح قبول نہیں کرتا اسے صاحب ایمان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

جو دو اور دو چار کہتا ہو حق پہ ہو، وہ مصالحت کس بات پر کرے کیا دو اور دو تین یا پانچ مان لے؟ باطل اپنے مقام سے جتنا چاہے ادھر ادھر ہو جائے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔۔۔ لیکن حق اگر اپنے مقام سے ذرہ برابر بھی سرک جائے تو وہ حق نہیں رہتا باطل ہو جاتا ہے۔ غلط جواب سینکڑوں ہو سکتے ہیں صحیح جواب ایک ہی ہوتا ہے۔

جب تک پانی کشتی کے نیچے رہتا ہے وہ کشتی کے تیرنے کا سہارا بنتا ہے۔ جب وہی پانی کشتی کے اوپر چڑھ آئے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ قوموں کی تباہی کا باعث دولت و ثروت کی فراوانی نہیں ہوتی۔ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب اس دولت کو پست جذبات حیوانیہ کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ خود ہماری تاریخ اس پر شاھد ہے۔

قرآن کریم کی رو سے جنت کی طرف جانے والا رستہ خطرات اور مشکلات سے پٹا پڑا ہے اور انہی کے مقابلہ سے انسانی ذات کی وہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں جو اسے حیاتِ ابدی کا مستحق بنا دیتی ہیں۔

جو شخص آباؤ اجداد کے مسلک پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے اس کا ذہن جامد اور اس کی فکر مردہ ہو جاتی ہے۔ وہ نہ اپنے

نظریات ومعتقدات کو محک علمی پر پرکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے نہ تحقیق وتجسس کی احتیاج۔ اس کے برعکس زندہ ذہن موروثی نظریات ومسالک کو پرکھتا ہے اور اگر ان میں کوئی سقم پاتا ہے تو تلاشِ صداقت میں سرگرداں رہتا ہے۔

اسلام میں نسبت صرف ایک ہی باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے دین کی نسبت۔۔۔ اگر مسلمان کہلانے کے بعد بھی رنگ، نسل، خون اور وطن کے امتیازات باقی رہ جاتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ اسلام کا یہ دعویٰ صرف زبان اور الفاظ تک محدود ہے۔

دین نام ہے اس نظامِ زندگی کا جس میں احکام خداوندی، بحیثیت قوانین نافذ ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسا اسی صورت میں اور اسی وقت ممکن ہے جب دین کے مدعیوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔

ارتقائے انسانیت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ معاشرے میں امن وامان رہے۔ لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت ہر طرح سے محفوظ رہے اور اس طرح انہیں اطمینان اور سکون میسر ہو۔ جس معاشرے سے یہ سکون اٹھ جائے اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس میں فساد برپا ہے۔

قرآن کریم۔۔۔ زمان ومکان کی حدود سے ماورا اور واقعات وحوادث کی احتیاج سے مستغنی ہے۔ وہ ان ابدی اصول و قوانین کا مکمل مجموعہ ہے جو علم خداوندی میں ازل سے موجود تھے اور جنہیں اپنے وقت پر انسانوں تک پہنچایا جانا مقصود تھا۔

''طاہرہ کے نام خطوط'' سے ماخوذ

عورت اور مرد میں فکر ونظر، خیالات وتصورات، معتقدات واصولات اور مسلک ومنہاج کا اختلاف جہنم پیدا کر دیتا ہے اس کے برعکس ان چیزوں میں ہم آہنگی اور یک رنگی گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔

نکاح نام ہے ایک بالغ مرد اور ایک بالغ عورت کے برضا ورغبت باہمی معاہدہ کا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن کر ان تمام حقوق وفرائض کا احترام کرتے ہوئے جو قرآن نے عائد کئے ہیں سکون ومحبت اور ہم آہنگی و یک رنگی کی زندگی بسر کریں گے اور اس طرح معاشرے میں ایک ایسا خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پا کر ہماری آئندہ نسل متوازن شخصیت کی حامل اور شرفِ انسانیت کی پیکر بنے۔

ہمارا سارا معاشرہ افراط وتفریط کے جُھولے میں جھول رہا ہے۔ اس میں سکون اور قیام کی اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں کہ ہم پرانے انسانوں کے خودساختہ معاشرہ کو بھی چھوڑ دیں اور نئی حدود فراموشیوں کو بھی الگ رکھ دیں اور معاشرہ کی بنیاد از سرِ نو قرآن کی حدود پر قائم کریں۔ اسی سے وہ جنت مل سکتی ہے جس سے نکلا ہوا آدم اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔

اگر تم کسی مرد یا عورت کو دیکھو کہ اسے عمر کے کسی حصہ میں یہ اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ اس نے کافی علم حاصل کر لیا ہے اور اب اسے مزید علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تو سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچہ ہے (کیونکہ) بچہ ہر سٹیج پر سمجھتا ہے کہ اس کا علم کامل ہے۔

عملی مثال، ہمیشہ زبانی وعظ سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ جن ریفارمرز کے اقوال اور عملی زندگی میں تضاد ہوتا ہے وہ کبھی قوم کی اصلاح نہیں کر سکتے۔

اجتماعی اور انفرادی زندگی درحقیقت ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست اور دوسری طرف دوستی کے تعلقات اور گھر کے اندر کی زندگی سب ان شاخوں کے برگ وبار۔ اگر درخت تندرست وتوانا ہے تو اس کی ہر شاخ سرسبز وشاداب ہوگی اور اگر اس کی اصل اور جڑ ہی کِرم خوردہ ہو چکی ہے تو اس کے پتے اور ٹہنیاں کسی طرح بھی ہری بھری نہیں رہ سکتیں۔

گھروں میں حقیقی امن وسکون اور میاں بیوی میں قلبی محبت اور مؤدت کا رشتہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ہم ان خودساختہ زنجیروں کو توڑ دیں جن میں ہم نے اپنی عورتوں کو صدیوں سے جکڑ رکھا ہے اور دوسری طرف ان بے باکیوں کو روکیں جنہیں ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کر لیا ہے..... تاکہ ہمارے گھر جنتی فضاؤں سے معمور ہو جائیں۔

تاریخ بہرحال ظنی ہے اور اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے اور یہ حقیقت بھی قطعاً یقینی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا کوئی قول یا عمل نہ قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے اور نہ ہی شرفِ انسانیت کے خلاف۔ اس لئے ہمیں ظنی چیزوں کو ہمیشہ یقینی چیزوں کے تابع رکھنا چاہئے اگر ہم اپنی تاریخ میں اتنی احتیاط برت لیں تو ہم دین کے معاملہ میں بہت سی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔

معراجِ انسانیتؐ سے ماخوذ

سیرت محمدیہ ﷺ درحقیقت، تعارف و تاریخ ہے اس انقلاب کی جس سے انسانیت پستیوں اور ناہمواریوں کے اس ذلت آمیز و کرب انگیز جہنم سے نکل کر جس میں اسے ملوکیت کی مستبدانہ دراز دستیوں، پیشوائیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں اور مفاد پرست گروہوں کی سفاکانہ خون آشامیوں نے دھکیل رکھا تھا، بلندیوں اور ہمواریوں کی اس روح پرور و نشاط انگیز جنت میں جا پہنچی جس میں ہر متنفس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی اور ثمر باری کے اسباب و مواقع بلا روک ٹوک موجود تھے۔

(مقدمہ، ص:24)

مسلمانوں نے جس طرح قرآن جیسے نیر درخشندہ کو انسانی تصورات و تخیلات کے بادلوں میں چھپا رکھا ہے اور اس طرح اس کی روشنی اور حرارت سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ ساری دنیا کو محروم کر رکھا ہے، اسی طرح انہوں نے سیرتِ محمدیہؐ کے جگمگاتے چراغ کو بھی اپنے توہمات اور معتقدات کے دبیز پردوں میں مستور کر رکھا ہے۔

(مقدمہ، ص:29)

جہاں انبیاء علیہم السلام سابقہ کی پیش کردہ تعلیم کائناتی حوادث یا انسانی دست برد کی نذر ہو گئی، وہاں ان حضرات کی سیرت بھی اس قدر مسخ کر دی گئی کہ وہ آنے والوں کے لئے اسوۂ حسنہ بننے کی بجائے الٹی ضلالت و غوایت کا موجب بن گئی۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر قرآن کریم نے حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے تمام اہم گوشوں کو خود اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس طرح خدا کی تعلیم ہمارے پاس حرفاً حرفاً اپنی اصل شکل میں موجود ہے اسی طرح خدا کے رسول ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کے اصولی گوشے نقشاً نقشاً اپنے حقیقی رنگ میں ہمارے لئے وجہ تابانیٔ قلب و نظر ہیں۔ (ص:37)

جس معاشرہ میں عیب عیب نہ رہے بلکہ ہنر بن جائے اس کی سیاسی اور بنیادی خرابیاں کسی تصریح کی محتاج نہیں رہتیں۔

(ص:39)

رسول ﷺ کی بعثت ایک ہنگامی واقعہ نہیں ہوتا کہ یونہی اتفاقی طور پر ظہور میں آ جائے۔ بلکہ یہ ایک اہم کڑی ہوتی ہے اس عظیم الشان سلسلہ کی جس کی رو سے انسانوں تک وحی کی راہنمائی پہنچائی جاتی ہے۔ (ص:39)

دنیا میں کونسا انقلاب ہے جس کی کامیابی کی داستانیں خونیں حروف سے نہیں لکھی گئیں؟ کونسی تحریک ہے جو شمشیر وسناں کے سایوں میں پروان نہیں چڑھی؟ حق و باطل کی کونسی آویزش ہے جس کے فیصلے قتل گاہوں میں نہیں ہوئے؟ صدقِ وعدل کی کونسی آواز ہے جسے دبانے کے لئے ابلیسی نظامِ استبداد نے دار ورسن سے گریز کیا ہے؟ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔ (ص:99)

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا سارا مدار اسلاف کی پرستش پر ہے۔ وہ پہلے اسلاف کی عظمت لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنے آپ کو ان اسلاف کی عظمت کے محافظ اور ان کے مسلک کے نگہبان کی حیثیت سے پیش کر کے لوگوں سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔ (ص:111)

سورج کی آنکھ نے جو کچھ اس کرۂ ارض پر دیکھا ہے اگر اس کی فلم تیار ہو سکے تو آپ دیکھیں گے کہ عقل انسانی کی تمام تگ وتاز اسی میں صرف ہوتی رہی ہے کہ عوام کو کس طرح قابو میں رکھ کر انہیں اپنی اغراض ومقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنایا جائے۔ جو اس فن میں زیادہ ماہر ہے وہی صاحبِ اقتدار وذی وجاہت ہے۔ (ص:112)

قوموں کی موت وحیات کا مدار ان کی قوتِ ایمانی پر ہے۔ اگر انہیں اپنے مسلک زندگی کی صداقت پر یقین ہے اور وہ یقین دل کی گہرائیوں میں پیوست تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے مقام سے نیچے نہیں گرا سکتی۔ (ص:130)

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درجِ ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 1200 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔
اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمائیے۔ شکریہ

1985,1986,1987,1988,1991,1999,2000,2001,2002,2003,
2004,2005,2006,2011,2015,2016,2017,2018,2019
,2020,2021,2022,2023

مفکرِ قرآن اور تحریکِ پاکستان کے گولڈ میڈلسٹ، علامہ پرویزؒ کو بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق ذاتی مشیر اور قابلِ اعتماد ساتھی ہونے کی سعادت حاصل تھی۔ جس کی ایک جھلک قائداعظمؒ کے درجِ ذیل خط سے عیاں ہے۔

10 AURANGZEB ROAD
NEW DELHI

14th June, 1947.

Dear Mr. Parvez,

I thank you for your letter of of 13th June. Will you please send me the names of those who, you think, will be the real servants of our future Secretariat?

Yours sincerely,

M. A. Jinnah

G. A. Parvez, Esq.,
37, Turkman Road,
NEW DELHI.

راولپنڈی 25 فروری 1985ء

سابق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کا تعزیت نامہ

علامہ غلام احمد پرویز کی بیوہ کے نام بھیجے گئے تعزیت نامہ میں سابق صدر نے فرمایا:

”آپ کے شوہر علامہ غلام احمد پرویزؔ کی المناک وفات پر مجھے دلی صدمہ ہوا ہے براہِ کرم میری تعزیت قبول فرمائیے۔

علامہ پرویزؔ کو تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ جس دوران انہوں نے قائداعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ محمد اقبالؒ کے خیالات و نظریات سے استفادہ کیا۔ بعد میں انہوں نے اپنی زندگی اسلام کے مطالعہ کے لئے وقف کر دی اور اسلام کی تشریح و تعبیر اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کے مطابق کی اس سلسلے میں ان کے بہت سے پیروکار ہیں۔

علامہ پرویزؔ کو قدرت نے زورِ قلم سے نوازا تھا جسے انہوں نے اپنے نظریات کو نہایت پُر اثر انداز میں تفصیلاً پیش کرنے کے لئے کامیابی سے استعمال کیا۔ تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص کارکن اور ایک عظیم و منفرد عالم کی حیثیت سے وہ مدتوں یاد رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے اور آپ کو یہ نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ بخشے۔“

مرتبہ: محمد اکرم راٹھور
(سابق چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

ماخوذ از منزل بمنزل

پرویزؒ صاحب کا پیغام

اراکین بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نام

رفیقانِ ہم سفر! السلام علیکم!

طلوعِ اسلام کا اجراء ایک ماہنامہ کی شکل میں 1938ء میں وجود میں آیا۔ اس وقت اگرچہ اس کا مسلک و مقصد تحریکِ پاکستان کی تائید تھا۔ لیکن اس کی یہ تائید ایک ''سیاسی مقصد'' کے حصول کے لئے نہیں تھی بلکہ اس کا موقف یہ تھا کہ اسلام ایک دین یعنی نظام کی صورت میں اسی وقت تک زندہ ہوسکتا ہے، جب کہ مسلمانوں کی اپنی ایک آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول واقدار کی حکمرانی ہو۔ بالفاظِ دیگر' پاکستان کا خطۂ ارض یا مملکت' اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور وہی بلند مقصد طلوعِ اسلام کا پیش نہاد تھا۔ تحریکِ پاکستان دو محاذ پر مشتمل تھی۔ سیاسی محاذ سے حضرت قائداعظم محمد علی جناح نبرد آزما تھے۔ وہ بساطِ سیاست پر اپنے مدِ مقابل کے مہروں کو مات دینے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے تدبر اور فراست نے دشمنوں میں ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ لیکن ایک دوسرا محاذ ایسا بھی تھا جو قائداعظم کے بس کا نہ تھا۔ یہ محاذ تھا ان مخالفین کی مدافعت کا جو قال اللہ اور قال الرسول کے نقاب میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں مقابلہ مذہبی پیشوائیت کے ان مہروں سے تھا، جنہیں جبہ و دستار کے تقدس میں دشمن اپنا آلۂ کار بنا کر آگے بڑھا رہا تھا۔ یہ تھا تحریکِ پاکستان کا وہ خالص دینی محاذ جس پر اس نازک دور میں طلوعِ اسلام معرکہ آراء رہا۔ اس محاذ پر اس کی معرکہ آرائیوں کی داستان محض ایک دو واقعات یا کارناموں تک محدود نہیں بلکہ دشمن نے اس محاذ پر مذہبی پیشواؤں کی ایک منظم فوج کھڑی کر رکھی تھی اور ان کے مقابلے میں لے دے کے ایک طلوعِ اسلام تھا جو انہیں شکست پر شکست دے کر تحریکِ پاکستان

> باادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ پروگرام کو بخیر وخوبی مکمل کر چکے ہیں جو اس کی اگلی کڑی کا تقاضا شروع کر دیا ہے؟ آپ کا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ قرآنی فکر کو ملک میں اس طرح عام کیا جائے کہ قرآنی نظام کے قیام کا تقاضا آپ کی اپنی جماعت ہی کا نہیں پوری ملتِ پاکستانیہ کا قلبی تقاضا بن جائے۔ ذرا سوچئے کہ کیا یہ کچھ ہم کر چکے ہیں؟ کیا اس فکر کی اشاعت ملک گیر ہو چکی ہے؟ کیا آپ اسے ہر کان تک پہنچا چکے ہیں۔ اور اسے ہر دل میں اتارنے کا فریضہ ادا کر چکے ہیں؟

کے دشمنوں کے منصوبے خاک میں ملاتا چلا گیا۔

حصولِ پاکستان کے بعد اس دینی محاذ نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اب سوال تھا اس مملکتِ خداداد میں دینِ خداوندی کو عملاً متشکل کرنے کا__ قیامِ پاکستان کے بعد سے طلوعِ اسلام اسی مقصود و منتہیٰ کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے ہے اور اس مدت میں اس نے قرآنی نظامِ حیات کے خدوخال کو نکھارا اور ابھار کر پیش کرنے کی سعی و کاوش برابر جاری رکھی ہے۔ یہ سعی و کاوش اب تحریکِ طلوعِ اسلام کے نام سے ایک مستقل شکل اختیار کر چکی ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنی تحریک کی بنیاد فکر و شعور پر رکھی ہے۔ وہ انسان کی فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ انہیں سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور دلیل و برہان سے ان کی نگاہوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب وہ اس طرح اس تحریک سے علیٰ وجہ البصیرت ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو انہیں آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان جو قدم پورے غور و فکر کے بعد علیٰ وجہ البصیرت آگے بڑھائے وہ اسے پھر پیچھے نہیں ہٹایا کرتا۔

چونکہ ہماری تحریک کی بنیادیں قرآنی حقائق پر استوار ہیں اور اس کا مقصد قرآنی نظام کی تشکیل ہے۔ اس لئے اس تحریک کو عام کرنے کے لئے ہم نے طریق بھی وہی اختیار کیا ہے جسے قرآنِ کریم تجویز کرتا ہے۔ یعنی فکری طریقِ عمل۔ ہم بھی ہر ایک سے بہ اتباعِ رسالت ﷺ یہی کہتے ہیں کہ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ (34:46)۔ میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى (34:46)۔ تم خدا کے لیے ایک ایک، دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ (34:46)۔ اس کے بعد سوچو اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا کہ انسانیت کی منزل کونسی ہے اور ہم کس راستے پر جا رہے ہیں تو تم یقیناً قرآن کی دعوت سے متعلق ہو جاؤ گے۔

جو حضرات اس طرح ذہنی طور پر اس فکر سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ان کے سامنے اگر مرحلہ یہ آتا ہے کہ جن حقائق کو انہوں نے ذہنی طور پر صحیح سمجھا ہے ان کے مطابق اپنے قلب میں بھی تبدیلی پیدا کریں اس لئے کہ قرآن اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے صرف ذہنی انقلاب ہی کو کافی نہیں سمجھتا وہ اس کے ساتھ قلبی تبدیلی کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا نام سیرت کی پختگی یا انسانی ذات کا استحکام ہے۔

جو احباب قرآنی فکر کے اس راستے میں ہمارے رفیقِ سفر بننے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں، ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہ حقیقت ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائے کہ یہ راستہ بڑا صبر آزما اور استقامت طلب ہے۔ جس میں خالی جذبات کی ولولہ انگیزی کچھ کام نہیں آتی نہ صرف یہ کہ کچھ کام نہیں آتی بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ میں یہ داستان اس لئے دہرا رہا ہوں کہ آپ میں سے جو احباب اپنے دل میں اس بادیہ پیمائی کا ولولہ رکھتے ہیں وہ اس مرحلہ کی شکیب آزمائی کا اچھی طرح جائزہ لے لیں اور خوب سوچ سمجھ لیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام اپنے اندر انقلاب پیدا کرنا ہے پہلے ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب اور جب تک وہ اس مرحلہ سے گذر نہیں جاتے، کوئی دوسرا پروگرام ان کے سامنے نہیں آ سکتا۔

1956ء میں بزموں کے ایک سالانہ اجتماع کا آغاز ہوا جسے طلوعِ اسلام کنونشن کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان اجتماعات میں تحریک سے متعلق تنظیمی امور پر بحث وتمحیص کے علاوہ بانیٔ تحریک محترم پرویز صاحب اراکینِ طلوعِ اسلام سے خصوصی خطاب فرماتے تھے۔ یہ خطابات درحقیقت تحریکِ طلوعِ اسلام کی تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ آج کی نشست میں، میں محترم باباجی کے ان خطابات سے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ اس سے جہاں تحریکِ طلوعِ اسلام کے بنیادی خدوخال ہمارے ذہنوں میں تازہ ہوجائیں گے وہاں تحریکِ طلوعِ اسلام کے تعارف کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوں گے۔

> کہ اس وقت ملک میں خالص فکری تحریک آپ کی ہے، باقی سب وقتی ہنگامہ آرائی ہے۔ جس میں اسلام کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، جیسے خطوں کی پیشانی پر (786) لکھ دیا جاتا ہے کہ اسے نفسِ مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یا اسے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بطورِ سپر استعمال کیا جاتا ہے۔ سلطانی ہو یا درویشی، اسلام کو ہر جگہ Exploit کیا جاتا ہے۔ اس کے دردکا مداوا کوئی نہیں سوچتا حقیقت یہ ہے کہ:
>
> کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
> گُلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

طلوعِ اسلام کی پہلی کنونشن 15 تا 19 نومبر 1956ء لاہور میں منعقد ہوئی تھی جس میں محترم پرویزؒ صاحب نے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے پہلا خطاب ''بادۂ زندگی'' کے عنوان سے کیا تھا۔ تحریک کی سست رفتاری پر شکوہ سنج احباب کو مخاطب کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

> ''بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اس فکر کو عام بھی کر دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا۔ قرآن کا مقصد تو اس نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے۔ کیا اس فکر کی عام نشر واشاعت سے یہ نظام متشکل ہوجائے گا؟ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اب تو خود زمانہ کے تقاضوں نے حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ کسی خیال کے عام کر دینے سے معاشرہ کا نظام خود بخود متشکل ہوجاتا ہے۔ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے جس میں انقلاب آئینی طور پر (Constitutionally) برپا ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ جس خیال کے حامل زیادہ ہوں، اسی کے مطابق نظامِ مملکت متشکل ہوجائے۔ آپ اس فکر کو عام کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح ایک قطرہ خون بہائے بغیر یہ انقلاب معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔ قرآنی نظامِ ربوبیت خود اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی اور نظام یا تصور اس کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ابھی تک دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جو حضرات اسے دوسروں کے سامنے پیش کریں وہ خود اسے اچھی طرح سمجھے ہوئے ہوں۔ اس لئے کہ تجربہ نے یہ بتایا ہے کہ اس تحریک کو اتنا نقصان مخالفین کے ہاتھوں سے نہیں پہنچتا جتنا ان موافقین کی طرف سے پہنچتا ہے جو اس کی ماہیئت سے خود

اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔

ان کی یہی باتیں مخالفین کے لئے اعتراضات کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ حضرات کی خود قرآن پر نگاہ ہو، ایسی نگاہ کہ اگر کبھی میں بھی غلطی سے کوئی ایسی بات کہہ دوں جو قرآن کے مطابق نہ ہو تو آپ مجھے فوراً ٹوک دیں۔ یاد رکھئے! دین میں سند اور حجت میرا بھی کوئی قول نہیں ہوسکتا۔ سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوسکتی ہے۔''

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن 18 تا 20 اکتوبر 1957ء راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔ اس کنونشن میں محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے ''خمِ زندگی'' کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''___ اس ضرورت اور احتیاط کی اہمیت کے پیشِ نظر، برادران! میں نے اب یہ مناسب سمجھا ہے کہ بزموں کے نظم ونسق اور باہمی ربط وضبط کے متعلق کچھ ہدایات منضبط کردی جائیں تاکہ ان سے مخلص رفقائے سفر کو راہ نمائی مل سکے۔ یہی ہدایات سرِدست آپ کے لئے دستور وآئین کا کام دیں گی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان ہدایات کو بغور پڑھ لیں۔ جو حضرات ان سے متعلق ہوں وہ اپنے آپ کو بزم طلوعِ اسلام سے متمسک رکھیں۔ جو یہ سمجھیں کہ اس سے ان کا دائرہ فکر وعمل تنگ ہوجائے گا، وہ اپنی تگ وتاز کے لئے دوسرے میدان کو تجویز کرلیں۔ قرآنی فکر وعمل طلوعِ اسلام کی اجارہ داری نہیں۔ جن کے دل میں اس کی لگن ہو وہ جو لائحہ عمل اور طریقِ کار اپنے لئے مناسب سمجھیں، اختیار کرسکتے ہیں لیکن (آپ مجھ سے متفق ہوں گے) کہ یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص بزمِ طلوعِ اسلام سے وابستہ رہے، اس کے لئے طلوعِ اسلام کی طرف سے نافذ کردہ ہدایات کی پابندی لازم ہوگی۔ یہ صورت تو کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول قرار نہیں پاسکتی کہ آپ ممبر تو ہوں بزمِ طلوعِ اسلام کے اور اپنے فکر وعمل میں طلوعِ اسلام کے مسلک ومقصد اور ہدایات وضوابط ❶ کے خلاف چلیں۔۔۔''

طلوعِ اسلام کی تیسری سالانہ کنونشن 19 تا 21 اپریل 1959ء لاہور میں منعقد ہوئی جس میں محترم پرویز صاحب نے ''پیامِ فصلِ بہار'' کے عنوان سے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام کو خطاب کیا۔ موصوف نے اسلامی آئین کی تدوین کے بنیادی اصول پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''لہٰذا آپ سوچئے کہ اس وقت آپ پر کتنی عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ سے کسی لمبی چوڑی قربانی کی بھی خواہاں نہیں۔ اس کا تقاضا فقط یہ ہے آپ اسلامی آئین کے قرآنی تصور کو زیادہ سے

---

❶ اصولی ہدایات بزم ہائے طلوعِ اسلام ماہنامہ طلوعِ اسلام ماہ نومبر 1957ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ طلوعِ اسلام نے انہیں علیحدہ بھی کئی بار شائع کیا ہے۔

زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ اس مقصد کے لئے آپ اپنی بے سروسامانی سے مت گھبرایئے۔ آپ کے دعوے کی صداقت، آپ کی نیتوں کا خلوص آپ کے عزم کی پختگی، آپ کے عمل کی مداومت، آپ کے ذرائع کی کمی کو پورا کردے گی۔ خدا کا کائناتی قانون، آپ کی رفاقت کا تھوڑا سا سہارا چاہتا ہے۔ آپ اس سے ہم آہنگی پیدا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کے نتائج کس قدر تحیرانگیز برآمد ہوتے ہیں۔ قدم بڑھایئے، زمانہ آپ کا بڑی بے تابی سے انتظار کررہا ہے۔

میری آپ احباب سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انہیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں۔ اگر وہ کسی سازش کے ماتحت ایسا نہیں کہتے۔۔۔ نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی دعوت منفرد ہے اور، کوئی اور دعوت اس کے مماثل نہیں۔

اسلام کے دشمن دانستہ اور نادان دوست نادانستہ ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے۔ لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ ''چلا ہوا کارتوس'' کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرسکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دے رہی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جارہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتادیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔''

طلوعِ اسلام کی چوتھی سالانہ کنونشن جو 7 تا 19 اپریل 1960ء لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس میں ''معمارِ حرم'' کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ جس میں تحریکِ طلوعِ اسلام کی تنظیم پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے فرمایا:

اب مجھے برادرانِ عزیز! آپ سے کچھ باتیں اپنی تحریک و تنظیم کے متعلق کرنی ہیں۔ جیسا کہ میں شروع سے کہتا چلا آرہا ہوں کہ اس تحریک کا تعلق نہ تو کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ مذہبی فرقے سے۔ یہ تو قرآنی فکر کو عام کرنے کی ایک منظّم کوشش ہے۔ جہاں تک اس قرآنی فکر کا تعلق ہے جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہے، اس کی بابت اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر آپ اس فکر کو اس لئے صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ میری فکر ہے۔ یعنی آپ کے پاس اس کے صحیح ہونے کی سند یہ ہے کہ ایسا پرویز صاحب کہتے ہیں تو یاد رکھئے کہ آپ نے نہ قرآنی فکر کو سمجھا ہے، نہ اس تحریک کو کیونکہ قرآنی فکر کے لئے نہ ''پرویز صاحب'' سند ہوسکتے ہیں نہ کوئی اور انسان۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس طرح غور و فکر کے بعد اسے صحیح سمجھتے ہیں تو اسے مانئے کہ آپ کا اسے اس طرح صحیح ماننا، میری سند سے نہیں ہوگا بلکہ براہِ راست قرآنِ

کریم کی سند سے ہوگا۔ اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں قرآنِ کریم کی بجائے کسی انسان کو سند مان لیا' آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ جو احباب اس طرح غور وفکر کے بعد طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو صحیح سمجھیں' ان کی باہمی تنظیم کا نام ''بزمِ طلوعِ اسلام'' ہے۔ جس کا مقصد اس فکر کو عام کرنا ہے۔ اراکینِ بزم کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپس میں محبت اور مؤدت سے رہیں۔ ان کی زندگی رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29) کی جتنی جاگتی تصویر ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں ایک دوسرے پر بھروسہ ہو۔ نصب العین کی وحدت اس قسم کا بھروسہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ تنظیمی معاملات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو اہمیت نہ دیں۔ اپنی بات منوانے پر ضد نہ کریں۔ دوسرے کو اپنے دل میں سمو لینے کے لئے آخری حد تک کوشش کریں۔ یاد رکھئے آپ کی تسبیح کا ایک ایک دانہ بڑا قیمتی ہے۔ یہ منتشر موتی خدا خدا کر کے اکٹھے ہوئے ہیں' انہیں بکھرنے نہ دیجئے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ جو شخص آپ کی پیش کردہ قرآنی فکر سے یکسر متفق نہ ہو' اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی یہ تنظیم پولیٹیکل پارٹیوں کی تنظیم سے بالکل مختلف ہے۔ پولیٹیکل پارٹیز کی تقویت کا راز ممبران کی تعداد میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس لئے پولیٹیکل پارٹیوں کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان کی تائید میں ہاتھ اٹھانے والوں کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ رکھیں۔ لیکن آپ کی تنظیم ہم آہنگیٔ فکر ونظر کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے جو شخص اس قرآنی فکر کو عام کرنے میں دل وجان سے آپ کے ساتھ شریک نہیں' اسے باندھ کر ساتھ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ قرآن کی محبت جس شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی ہے وہ اگر کسی وقت ہنگامی جذبہ سے مغلوب ہو کر آپ سے علیحدگی بھی اختیار کر لیتا ہے تو وہ زُود یا بدیر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ ایسی رفاقت اسے کہیں اور نہیں مل سکے گی۔

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن 7 تا 9 اپریل 1961ء بھی لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس میں ''مژدۂ صبح'' کے زندگی بخش عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

برادرانِ عزیز! اس مقام پر میں آپ کی خدمت میں ایک بنیادی نکتہ پیش کروں گا۔ دنیا کے عام پروگراموں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں وہ کامیابی کے قریب پہنچتے جاتے ہیں' سفر کی صعوبتیں کم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے پروگرام کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں کامیابی وکامرانی مزید ذمہ داریوں کا موجب بن جاتی ہے۔ سورہ النصر اس کی زندہ شہادت ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ: اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾ (110:1-2) جب اللہ کی نصرت قریب آ جائے اور

فتح وکامرانی سامنے کھڑی دکھائی دے۔ اور تو دیکھے کہ لوگ فوج درفوج نظامِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں' تو یہ نہ سمجھ لینا کہ بس اب ہمارا کام ختم ہوگیا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ﴿٣﴾ (110:3)۔ اس وقت نظامِ خداوندی کو وجہ حمد وستائش بنانے کے لیے اور بھی سرگرمی سے مصروفِ عمل ہوجاؤ۔ اور مخالف قوتوں سے حفاظت طلبی میں اور بھی شدت سے کوشش کرو۔ تم یہ کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کی رحمتیں کس تیز خرامی سے تمہاری طرف لوٹ کر آتی ہیں۔ یعنی جس وقت یہ پروگرام منزل تک پہنچ جائے اور اسے قبولیتِ عامہ حاصل ہوجائے تو اس کے بعد بھی تمہاری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے تو منزل ابھی آئی ہی نہیں۔ ابھی صرف اس کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے ہمارے لیے ابھی بہت کام باقی ہے۔ آپ صرف اتنا دیکھئے کہ آپ نے جو تھوڑی بہت کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ کس قدر حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہے۔ اگر ہم اپنی کوششوں کی رفتار اور تیز کردیں تو پھر دیکھئے کہ ان کے نتائج کس قدر تحیر انگیز اور مسرت خیز ہوتے ہیں۔ آپ ذرا سی ہمت اور کیجئے۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ حقیقت بے نقاب ہوکر سامنے آتی ہے۔

آخر میں' میں اپنی اس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا کہ:

1۔ اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور وخیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

2۔ اپنے قوم سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

3۔ قرآنی فکر کی نشر واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصتہً لوجہہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

4۔ آپ سے کسی قسم کی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ بازی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

5۔ اپنے وقت اور توانائی کو' ضدی طبقے کے ساتھ بحث وتمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف ان لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم وبصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

6۔ آپس میں محبت اور پیار' مودت اور الفت کے ساتھ رہو کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔''

طلوعِ اسلام کی سالانہ چھٹی کنونشن 13 تا 15 اپریل 1962ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر ''شعلۂ نمناک'' کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی تفسیر فرمائی ہے جس میں موصوف نے کہا تھا کہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

اس لئے اس خطاب کے چند اقتباسات پیش کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے خوشبو کی تلاش میں پتی کا مسل دینا ہے۔ اس لئے میں اس خطاب کو کچھ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کی سست روی کا گلہ کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

''اس ضمن میں عزیزانِ من! میں ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے جو حضرات کچھ عرصہ سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں' وہ تو اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں لیکن نو وارد احباب جو ایک خاص ولولہ لے کر شریکِ محفل ہوتے ہیں انہیں اس نکتہ کے سمجھنے میں ذرا وقت لگتا ہے۔ جو کچھ میں اس مقام پر کہنا چاہتا ہوں۔ اس کا اولین مخاطب یہی طبقہ ہے۔ ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں۔ ہمارے ہاں ہنگامی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں نے اس قسم کا تصور عام کر رکھا ہے کہ جس پروگرام میں ہنگامہ خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں' وہ پروگرام عملی نہیں ہوتا۔ عملی پروگرام کے لئے' بگولوں کا سا رقص اور طوفان کا سا جوش و خروش ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد تحریک ہے جس کا مقصد لوگوں کے قلب و نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اس لئے اس نے قرآن کریم کی تعلیم سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ط (13:11)۔ جب تک کسی قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہیں ہوتی، اس کی حالت نہیں بدل سکتی۔ طلوعِ اسلام کا مقصد قوم میں اس نفسیاتی تبدیلی کا پیدا کرنا ہے اور یہ مقصد ہنگامہ آرائیوں سے حاصل نہیں ہوسکتا' خاموش لیکن استقامت آمیز تبلیغ سے ہوسکتا ہے۔ لاہور کا تو مجھے علم نہیں لیکن کراچی میں برسوں تک ایک عجیب منظر دکھائی دیتا رہا۔ شام کے وقت شہر کی سب سے بارونق سڑک انفنٹن سٹریٹ کے چوراہے پر ایک کونے میں، ایک یورپین نوجوان خاموش کھڑا دکھائی دیتا۔ عمدہ سوٹ میں ملبوس ایک تھیلہ گلے میں لٹکائے اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ لئے خاموش کھڑا رہتا ہے۔ اگر کسی نے پمفلٹ مانگا تو اس نے زبان سے ایک لفظ کے بغیر ہاتھ والا پمفلٹ اسے دے دیا اور ایک اور پمفلٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اسے ہفتوں' مہینوں' برسوں اسی طرح دیکھا۔ اس قسم کے اور نوجوان بھی شہر کے مختلف مقامات پر اسی طرح کھڑے ملتے۔ یہ ایک عیسائی تبلیغی ادارہ کے مشنری تھے۔ لوگ ان کی اس ''بے معنی'' حرکت کا مذاق اڑاتے۔ لیکن جب ان کی رپورٹ شائع ہوتی تو اس سے معلوم ہوتا کہ ان کی وہ خاموش تبلیغ کس قدر گہرا اور وسیع اثر کرتی جا رہی ہے۔ وہ دراصل اس طرح متجسس لوگوں کا رخ اپنے مرکزی ادارہ کی طرف موڑ دیتے تھے۔

ہمارے سامنے بھی برادرانِ عزیز! اسی قسم کا پروگرام ہے۔ ہمارا مقصد قرآنی تعلیم کی تبلیغ ہے۔ یعنی اس فکر کو خود سمجھنا اور سمجھنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا ___ لٹریچر کے ذریعے پہنچانا اور معاملات میں اپنے حسنِ کردار کے ذریعے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ اس پروگرام کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ یہ ختم ہی نہیں ہوسکتا۔ لیکن قرآنی پروگرام اور ان خاموش مشنریوں کے پروگرام میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ خاموش کھڑے رہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یہ زندگی کا منفیانہ پہلو (Negative Aspect) ہے اور عیسائیت کی خصوصی تعلیم۔ قرآن مثبت پہلو (Positive Aspect) کو سامنے لاتا ہے اور اسی کو صحیح طریق قرار دیتا ہے۔ یہ وہ طریق ہے جو ملتِ اسلامیہ کے مؤسس حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خدا کی طرف سے اس وقت ملا جب آپ نے قوم کی حالت سے شدید طور پر متاثر ہوکر بدرگاہِ ربّ العزت عرض کیا رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ (2:260) مجھے بتا کہ اس قسم کی بے حس اور مردہ قوم کس طرح سے زندہ ہوگی؟ وہ طریق کیا تھا؟ یہ کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ (2:260)۔ یعنی وہی طریق جس سے وحشی پرندوں کو سدھایا جاتا ہے۔ ان پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور وہ جھٹ سے اڑ گئے۔ ان پرندوں کو سدھانے کے لئے خاموش کھڑے رہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ انہیں حُسنِ سیرت سے اپنے ساتھ اس قدر مانوس کرنا پڑتا ہے کہ آپ انہیں کھلی فضا میں چھوڑ کر جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا (2:260)۔ آپ کی آواز پر وہ دوڑتے ہوئے آپ کی طرف آجائیں گے۔ یہ مثبت پروگرام ہے۔ لیکن اس میں ہنگامہ آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ دخل تو ایک طرف اگر انہیں سدھانے کے دوران میں کہیں ذرا سی ہچکچاہٹ آجائے یا آپ سے کوئی خلافِ معمول اور غیر مانوس خفیف سی حرکت سرزد ہوجائے' تو وہ فوراً بدک جائیں گے لہٰذا اس کے لیے نہایت صبر وسکون کے ساتھ ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ندی کی سی روانی اور چٹان کی سی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہی ہمارا پروگرام ہے اور اسی پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔ اس تبلیغ کے ذرائع میں عندالضرورت اور حسبِ اقتضائے وقت تبدیلی آتی رہے گی لیکن کسی بے تابیٔ تمنا کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے پروگرام میں ہنگامہ آرائی کا دخل کبھی نہیں ہوگا۔ جو احباب اس پروگرام میں شریک ہونا چاہیں' انہیں اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں پروانے کی طرح جلنا ہے۔ مرغِ سحر کی طرح شور نہیں مچانا۔

اس سلسلہ میں ایک اور ضروری بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں' اور ان کا تعلق بیشتر قدامت پرست مذہبی طبقہ سے ہوتا ہے' کہ تعصب' ضد اور ہٹ دھرمی جن کا شعار ہوتا ہے اور انہوں نے

پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کی سننی ہی نہیں ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ :اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ۝۶ (2:6)۔ جولوگ پہلے ہی سے فیصلہ کئے بیٹھے ہوں کہ کچھ بھی ہو، ہم نے کسی کی بات ماننی ہی نہیں، انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔۔۔ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ کبھی صداقت کی بات نہیں مانیں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَاہۡجُرۡہُمۡ ہَجۡرًا جَمِیۡلًا۝۱۰ (73:10)۔ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی اختیار کرلو۔ اس قسم کی جامد، متعصب اور ضدی ذہنیتوں کے سامنے قرآنی فکر پیش کرنے میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ذرا وقتِ نظر سے کام لیا جائے تو ایسے لوگوں کو پہنچاننے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔ قرآنی فکر ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے جو زندگی کے عملی مسائل میں غور وفکر کرنے اور علم وبصیرت کی رُو سے انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزومند ہوں۔ قرآن کا خطاب ہی ان لوگوں سے ہے جن میں زندگی کی کچھ رمق اور حرارت ہے۔لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا (36:70)۔ یہی وہ زمین ہے جس میں اس فکر کا تخم صالح شجرِ طیب بن کر پھولتا پھلتا ہے۔

دوسری بات جس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے، اس سے بھی اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ دانا دشمن کس طرح اچھا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن نادان دوست کس قدر نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کا تجربہ مجھے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے یہ ''نادان دوست'' ہماری تحریک سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے بعض بزموں کے ممبر بھی ہیں۔ طلوعِ اسلام کا مدت سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لٹریچر کے مطالعہ کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ لیکن حالت ان کی یہ ہے کہ وہ طلوعِ اسلام کی تحریک، اس کی پیش کردہ قرآنی فکر اور خود میرے متعلق ایسے ایسے عقائد ونظریات لوگوں سے بیان کرتے ہیں جنہیں سن کر میں محوِ حیرت رہ جاتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ:

خدا مجھے میرے ان دوستوں سے بچائے!

میرا اندازہ ہے کہ آپ کی تحریک کو اتنا نقصان آپ کے مخالفین کے سب وشتم سے نہیں پہنچتا، جتنا ان متفقین کو نوازِ شہائے بیجا سے پہنچتا ہے۔ یہ حضرات تحریک کے لئے بڑے ہی خطرناک واقع ہوئے ہیں اور ان کی اس حرکت کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ:

(i) جب آپ سے کوئی شخص ___ تحریک اس کے نظریات یا میرے عقائد ومسالک کے متعلق کچھ پوچھے تو یہ دیکھے کہ اس کا جواب ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب رسالہ یا پمفلٹ میں ہے؟ اگر ہو تو

دریافت کرنے والے سے کہئے کہ میں فلاں تحریر آپ تک پہنچادوں گا۔اس میں آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا۔

میں مختلف بزموں کے نمائندہ حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ براہِ کرم اپنے اراکین پر اس سلسلہ میں کڑی نظر رکھیں اور اگر کوئی رکن اس کی خلاف ورزی کرے تو اس سے مواخذہ کریں۔اگر کوئی رکن تنبیہہ کے باوجود اس سے باز نہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ شامل ہی آپ کی تحریک کو نقصان پہنچانے کے لئے ہوا ہے۔تحریک کو اس سے بچاتے رہئے۔

اس مقام پر میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ طلوعِ اسلام صرف ان باتوں کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ان کے علاوہ وہ کسی بات کا بھی ذمہ دار نہیں،خواہ اسے کوئی بھی اس کی طرف منسوب کیوں نہ کرے۔

اب میں' عزیزانِ من! اس خطاب کے سب سے اہم گوشے کی طرف آتا ہوں۔آپ قرآنی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔یہ بڑی مبارک بات ہے۔لیکن قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم ہماری سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو یہ ذہنی تفریح سے زیادہ کچھ نہیں۔اگر اس سے ہمارے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ایسا انقلاب پیدا نہیں ہوتا جس کی جھلک ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ پائی جائے تو ایسی قرآن فہمی محض مشاعروں کی داد ہے۔جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل ونگاہ کی اس مسلمانی کا مظاہرہ ہماری رفتار وگفتار وکردار سب میں ہونا چاہئے اگر ہماری سیرت پاکیزہ' نگاہ بلند' کردار پختہ اور معاملات صاف نہیں تو ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تعلیم کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیں کہ ہم ان سے بہت آگے ہیں۔کیونکہ ہم قرآنی تعلیم کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں' قرآن کو سمجھنے والوں کی زندگیاں ایسی ہونی چاہئے جن سے وہ چلتے پھرتے دوسروں سے ممتاز اور متمیز نظر آئیں۔اور جس کسی کو ان سے کبھی واسطہ پڑے وہ ان کے حسنِ معاملہ سے متاثر ہو کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ

دیدہ ام مردے دریں قحط الرجال

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پیشِ نظر پورے کے پورے معاشرہ میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک معاشرہ میں ایسا انقلاب نہ آجائے' ہم اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔غلط معاشرہ کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر انفرادی طور پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔لیکن زندگی کے جن

دائروں میں ہم مجبور نہیں، وہاں کونسی چیز مانع ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے اندر حسنِ سیرت پیدا نہ کریں؟ اپنی ہر کمزوری کے لئے معاشرہ کی مجبوری کو سپر بنالینا، بہت بڑی خودفریبی ہے۔ قرآن کا نام لینے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی خودفریبی میں مبتلا رکھیں۔ صداقت، اخوت، محبت، شفقت، حسنِ معاملہ، ایفائے عہد، کشادہ نگہی، وسعتِ ظرف، تحمل، بردباری، پاکیزگی، عمدہ خیالات، عفتِ قلب ونظر۔ یہ ہمارے امتیازی نشان ہونے چاہئیں، میں نے ان چند خصوصیات کا ذکر محض مثال کے طور پر کیا ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ ہماری ساری زندگی سیرتِ محمدیہ ﷺ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئے۔ کہ قرآن فہمی کا فطری نتیجہ یہی ہے۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا رہن سہن نہایت پُروقار اور سنجیدہ ہو اور ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ آپ چلتے پھرتے شریف انسان دکھائی دیں جو خود بھی امن وسلامتی میں رہیں اور دوسروں کے لئے بھی امن وسلامتی کے پیامبر اور آرزومند ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ اس کے برعکس عدل اور احسان آپ کا شیوۂ زندگی ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ آپ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطۂ زمین کے استحکام میں ضعف آنے پائے۔ اس لئے کہ ہماری درخشندہ اُمیدیں اور تابناک آرزوئیں اس خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصور عام کررہے ہیں اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہوسکے گی۔ عام لوگوں کے لئے یہ خطۂ زمین محض ایک مملکت ہے۔ لیکن ہمارے لئے قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ اور نوعِ انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ۔ اس سے ہمارے نزدیک اس کی سالمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ہمارے ایک طرف ہندو جیسے تنگ نظر دشمن کے مذموم عزائم ہیں جو اپنی کئی مجھکوں کی غلامی اور محکومی کا انتقام ہم سے لینا چاہتا ہے اور دوسری طرف روسی کیمونزم کا بلائے بے درماں ہے۔''

طلوعِ اسلام کی ساتویں سالانہ کنونشن 11 تا 14 اپریل 1963ء کو شاہ جمال کالونی لاہور میں منعقد ہوئی ''قیامتِ موجود'' کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

طلوعِ اسلام کا پروگرام یہ ہے کہ ہم نہایت پُرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرتے جانا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہمارے پیشِ نظر کوئی پروگرام نہیں۔۔۔ حتیٰ کہ ہم ملک کی عام عملی سیاست میں بھی حصہ نہیں لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں کسی فکر کی نشرواشاعت کے لئے جس قدر سامان وذرائع کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارے پاس اس کی بے حد کمی ہے۔ لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لئے اُٹھو تو کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی، کچھ اس کا اثر ہے کہ سامان وذرائع کی اس قدر کمی

کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جارہی ہے وہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔ آپ ذرا دس بیس برس پہلے اِدھر کا نقشہ سامنے لایئے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ آواز کس طرح خاموش ہی خاموش سے ہر گوشے کو متاثر کئے جارہی ہے۔ موصوف نے فرمایا:

یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ قرآن کی عظمت وصداقت کے معترف تو ایک طرف' اس آواز کے شدید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں قرآن کی آیات' دین کی اصطلاحات اور نظامِ خداوندی کے استعارات' استعمال کرنے پر مجبور ہورہے ہیں۔

جنابِ شیخ! وضو کے لئے سہی' لیکن کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

برادرانِ من! آپ نے قرآن کی آواز کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا میرے دل پر خاصا اثر ہے۔ آپ نے سخت نامساعد حالات میں اپنی بے بضاعتی اور گم مائیگی کے باوجود اس دیے کو اپنے خون سے روشن رکھا ہے۔ اس کے باوجود مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ قرآنِ کریم ہم سے جو توقعات وابستہ رکھتا ہے' ہم انہیں کما حقہٗ پورا نہیں کررہے۔ یہ تو اس کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف ہے جو ہمیں وہ اپنے دامن سے جھٹک نہیں دیتا۔ ورنہ حق بات تو یہی ہے کہ ہم اس کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔

محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزم سے درخواست کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(قرآن کے) وابستگان دامن کو تو' جان اور مال دونوں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پڑتے ہیں۔ ہم اس سودے کا بیعانہ تک بھی ادا نہیں کرسکے۔ اس لئے میں آپ احباب سے درخواست کروں گا کہ آپ اس باب میں مزید ہمت کیجئے۔ انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے۔ قدیم تصوراتِ حیات اور نظام ہائے زندگی کا دور ختم ہورہا ہے۔ ملوکیت' سرمایہ داری' مذہب سب ایک ایک کرکے اٹھتے اور مٹتے جارہے ہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا! تماشا دکھا کر مداری گیا!

اس وقت لا کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں' اس کے بعد' ان کے مقام سے ہٹانے یا الاّ اللہ تک لانے میں' نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے۔

اس لئے برادرانِ گرامی قدر! وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو تیز تر کردیجئے اور قرآنی فکر کی

نشر واشاعت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ جوش وانہماک کے ساتھ مصروفِ عمل ہوجایئے۔

طلوعِ اسلام کی آٹھویں سالانہ کنونشن 12 تا 15 نومبر 1964ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے ''حرف دلنواز'' کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ مفکرِ قرآن کے اس ''حرف دلنواز'' میں حیاتِ اجتماعیہ کے بڑے اہم اور بنیادی حقائق مضمر تھے۔ یہ شاید ان کا پہلا خطاب تھا جس میں دعوتِ قرآنی کے علمبرداروں کو ان نازک ترین گوشوں سے باخبر کیا گیا ہے جو کہ ہر ابھرتی ہوئی تحریک کے لئے ابتلاء وآزمائش کا سامان بنتے ہیں۔ یوں تو پرویز صاحب زندگی کی ہر حقیقت کا سراغ قرآن کی بارگاہ سے لاتے ہیں لیکن اس خطاب کا تو خصوصی امتیاز ہی یہی تھا کہ انہوں نے قرآن ہی کی زبان میں اس ذہنیت کی پوری تفصیل رفقائے سفر کے سامنے رکھ دی جو ہمدردی' دوستی' رفاقت اور تعاون کے نام پر ہر تحریک کے مستقبل کو زیروزبر کرنے کے درپے رہتی ہے۔ جو ذاتی مقاصد کی بجاآوری کے لئے ہر تحریک میں ہراول دستہ بن کر شریک ہوتی ہے اور انہی مقاصد کے پیشِ نظر تحریک کو خطرے میں ڈال کر رخصت ہوجاتی ہے۔ موصوف نے کہا کہ قرآنی نظام کی انقلابی تحریک کے داعیوں کو اس قسم کے خطرات سے محتاط رہنے کی ازبس ضرورت ہے۔ قرآنی دعوتِ انقلاب کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

> قرآنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے' اور وہ یہ کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کی جماعت لبیک کہتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم' اس دعوت کی سب سے پہلی آواز کو سامنے لاتے ہی اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لایا ہے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کے دولت مند طبقہ کے سامنے دعوت کو پیش کیا تو انہوں نے اعتراض ہی یہ کیا کہ ہم تمہاری جماعت میں کس طرح شامل ہوجائیں جبکہ حالت یہ ہے کہ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا (11:27) اس جماعت میں جو لوگ شامل ہوئے ہیں وہ ہمارے معاشرہ کے نہایت ادنیٰ درجے کے کمین لوگ ہیں۔ بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ (11:27)۔ ان کی شکل وصورت سے ظاہر ہے کہ وہ کس حیثیت کے مالک اور کس عقل وفکر کے حامل ہیں۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (11:27)۔ کچھ اونچے طبقہ کے لوگوں کی جماعت ہوتی تو ہم اس میں شامل بھی ہوجاتے۔ آپ ان لوگوں کو جماعت سے نکال دیں' پھر ہم اس میں شامل ہوجائیں گے۔ ان لوگوں سے آپ کو کیا ملے گا؟ ان کے اس مطالبہ اور اعتراض کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے جو کچھ کہا' وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (26:112)۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں؟ نہ ہی مجھے ایسا کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ قلبِ سلیم لے کر حاضر ہوئے ہیں اور میزانِ خداوندی میں وزن مال ودولت کا نہیں' قلب و نگاہ کا ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ اپنی دولت اور وجاہت پر ہے اور خدا کی نگاہ ان کے خلوص اور حسنِ نیت

پر۔۔۔اس لئے تمہارے مال و دولت تمہیں مبارک' میرے لئے یہی مفلس و نادار دنیا کی سب سے بڑی متاع ہیں۔۔۔اور یہی وہ شکایت تھی جو سردارانِ قریش کو نبی اکرم ﷺ کے خلاف تھی۔یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے' آسمانی انقلاب کے ہر داعی کی توجہ سورۂ عبس کے تمثیلی انداز میں منعطف کرائی ہے۔۔۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! آپ کی حقیقی متاع یہی غریب و نادار سے رفیق ہیں۔۔۔ جن کے سینے میں ایسا گرم دل ہے جس کی حرارت' موم کے بنے ہوئے بڑے بڑے مہیب ''خداؤں'' کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔۔۔لہٰذا میرے عزیز بھائیو! لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ (15:88)۔تم ان مفاد پرستوں کے مال و دولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور اپنی توجہ اپنے ان نادار لیکن مخلص رفیقوں پر مرکوز کرو جو آپ کی حقیقی متاع ہیں۔۔۔میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مال و دولت والوں میں مخلص اور وفا شعار ہوتے ہی نہیں۔اور نہ ہی یہ کہ آپ کی تحریک کو آگے بڑھنے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کی صداقت اور خلوص کی بناء پر نہیں' بلکہ محض مالی امداد کے سہارے تحریک میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شامل ہوں' وہ تحریک کے لئے ہمیشہ نقصان کا موجب ہوں گے۔آپ کی تحریک میں معیارِ فضیلت' تقویٰ ہونا چاہئے۔یعنی خلوصِ قلب کے ساتھ فرائض منصبی کی ادائیگی۔نہ کہ مال و دولت اور جاہ و حشمت۔آپ یہ نہ دیکھئے کہ کسی کے پاس کیا ہے۔یہ دیکھئے کہ وہ خود کیا ہے! وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا ۚ (46:19) آپ کا بنیادی معیار ہونا چاہئے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد بیان کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

آپ کی تو تحریک کا مقصد ہی یہی ہے کہ قرآنی تعلیم کی رُو سے آپ کے اپنے اندر تبدیلی کس قدر پیدا ہوئی ہے۔اس کے لئے آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار ہی ''تبدیلی'' ہونا چاہئے نہ کہ خارجی مقبوضات۔۔میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع یہ رکھا ہے کہ ''مومن کسے کہتے ہیں''۔آپ اسے بغور دیکھئے اور پھر اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتے رہئے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔اگر آپ کے اندر قرآنی زاویۂ نگاہ سے تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر' میرے عزیز دوستو! نہ آپ کو قرآنی فکر کا سمجھنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ وابستگی کچھ مفید ہو سکتی ہے۔اور جب میں ''آپ'' کہتا ہوں تو اس کے اندر اپنے آپ کو سب سے پہلے شامل کرتا ہوں۔اس داخلی تبدیلی کے بغیر یہ آپ کے اجتماعات و تقاریب' آپ کے درس اور تقاریر' کھیل تماشہ سے زیادہ کچھ نہیں۔۔۔

محترم پرویز صاحب نے اپنے اس خطاب کے آخر میں قرآنی احباب سے اپیل کی کہ وہ وقت کے تقاضوں پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔دنیا اپنے مختلف تجارب میں ناکامی کے بعد سرِ راہ مایوس کھڑی ہے۔

قرآن کے بابِ عالی کے سوا اس کی نجات وسعادت کی کوئی اور راہ نہیں۔ اس لئے اٹھئے اور اپنی رفتار کو تیز تر کر دیجئے اور نوعِ انسانی کو یہ بتایئے کہ اس کی مشکلات کا حل قرآن کی بارگاہ کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔

طلوعِ اسلام کی نویں سالانہ کنونشن 17 تا 20 مارچ 1966ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب نے جو خطاب فرمایا اس کا عنوان تھا ''آپ آ گئے تو رونق کا شانہ ہوگئی'' اس خطاب میں موصوف نے بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبی عشق کی کشمکش کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

یاد رکھئے! ہمارا طریقِ کار ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری نہیں۔ ہمارا طریق نہایت خاموش اور پُرامن طور پر قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ تاکہ اس نظام کے قیام کا تقاضا لوگوں کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ ہم میں سے بعض تیز طبائع پر اس طریقِ کار کی سست روی بعض اوقات گراں گزرتی ہے۔ وہ عام سیاسی جماعتوں کے سے ہنگامہ آرائی کے پروگرام اختیار کرنے کی تجویز کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہمارا یہ طریقِ کار، قرآنی فکر، تاریخی شواہد اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہے۔ جو احباب ہمارے ہم سفر ہونا چاہیں انہیں یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر شریک ہونا چاہئے۔ یہ کوہ کنی بڑی صبر آزما ہے۔ یہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے جس میں قدم قدم ہی چلا جا سکتا ہے ورنہ۔۔۔ سانس اکھڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔۔۔ اس قسم کی بیتابیٔ تمنا کا مظاہرہ بعض ایسے افراد کی طرف سے ہوتا ہے جو تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ اور پروگرام بھی ملنا چاہئے۔ میں ایسے احباب سے باادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ پروگرام کو بخیر وخوبی مکمل کر چکے ہیں جو اس کی اگلی کڑی کا تقاضا شروع کر دیا ہے؟ آپ کا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ قرآنی فکر کو ملک میں اس طرح عام کیا جائے کہ قرآنی نظام کے قیام کا تقاضا آپ کی اپنی جماعت ہی کا نہیں پوری ملتِ پاکستانیہ کا قلبی تقاضا بن جائے۔ ذرا سوچئے کہ کیا یہ کچھ ہم کر چکے ہیں؟ کیا اس فکر کی اشاعت ملک گیر ہو چکی ہے؟ کیا آپ اسے ہر کان تک پہنچا چکے ہیں۔ اور اسے ہر دل میں اتارنے کا فریضہ ادا کر چکے ہیں؟ جب آپ اس فریضہ سے فارغ ہو جائیں گے تو پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا مطالبہ کیجئے گا۔ اس وقت اگلی کڑی کا مطالبہ قبل از وقت ہے۔

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

طلوعِ اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن 9 تا 12 نومبر 1967ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس میں محترم پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا ''نوائے صبح گاہی'' اس خطاب میں محترم موصوف نے احتسابِ خویش کی طرف خصوصی طور پر توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

یاد رکھئے! قرآنِ کریم کا حقیقی مقصد انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے اور یہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا، جب تک قرآنی فکر انسان کے قلب کی گہرائیوں تک نہ اترے۔۔۔اس بات کو پرکھنے کا معیار کہ کس کی شخصیت کس حد تک متوازن ہو چکی ہے، یہ ہے کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کا انعکاس کس حد تک ہوتا ہے۔ اسی کو خدا کے رنگ میں رنگے جانا کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں صفاتِ خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) کا تذکرہ اس اصرار و تکرار کے ساتھ آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ ہماری سیرت کے پرکھنے کا نہایت واضح خارجی معیار بن سکیں۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے محترم پرویزؒ صاحب نے کہا:

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں خالص فکری تحریک آپ کی ہے، باقی سب وقتی ہنگامہ آرائی ہے۔ جس میں اسلام کا نام اس طرح لیا جاتا ہے، جیسے خطوں کی پیشانی پر (786) لکھ دیا جاتا ہے کہ اسے نفسِ مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یا اسے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بطورِ سپر استعمال کیا جاتا ہے۔ سلطانی ہو یا درویشی، اسلام کو ہر جگہ Exploit کیا جاتا ہے۔ اس کے درد کا مداوا کوئی نہیں سوچتا حقیقت یہ ہے کہ:

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے گُلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

یہ بات آپ ہی کرتے ہیں اور آپ کا پروگرام یہی ہے کہ آپ گُلوں کے رنگ اور خوشبو سے بے نیاز ہو کر، ان کے چاکِ گریبان کی بات کئے جائیں۔ اگر آپ نے اپنی کوششوں کو اسی طرح جاری رکھا تو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ زمین کس طرح اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔۔۔باقی رہی اس فکر کی مخالفت۔ سو میرے عزیزو! میرے رفیقو! میرے ہم سفرو! قرآنی فکر و نظام کے خلاف یہ یورشیں چند روزہ ہیں۔ آپ اسی طرح ہمت کئے جائیے، یہ ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو جائیں گی۔۔۔آپ اس حقیقت پر یقین رکھئے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے کہا:

لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے۔ جہاں کوئی باہر کا رہزن، ڈاکہ زنی نہیں کرتا۔ خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر و معاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی چنگاری ہے جو سب متاعِ عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز

سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ (17:7)۔ تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لئے نہیں' بلکہ خود تمہاری بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ (2:272)۔ جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لیے بناؤ اور اس کا احسان اہلِ محلہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور اس کے شکریہ کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس۔۔۔ کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لیے کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت' یا ایثارِ وقت۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لئے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اجر و معاوضہ کی تمنا یا صلہ و ستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف' قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

طلوعِ اسلام کی گیارہویں سالانہ کنونشن 11 تا 13 اکتوبر 1968ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی نغمۂ توحید کے طائرانِ چمن سے محترم پرویز صاحب نے ''جہانے دیگرے'' کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

میں قرآنی تحریک کے سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ کو بھی سامنے لانا چاہتا ہوں' میں نے دیکھا یہ ہے کہ جو احباب اس فکر سے خاصی دلچسپی لیتے ہیں' وہ بھی اکثر و بیشتر اسے ایک ذہنی تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اور بہت بڑی خود فریبی کا موجب۔ قرآن کو بے شک سمجھا ذہنی طور سے ہی جاتا ہے۔ لیکن اس کا مہبط درحقیقت انسانی قلب ہے۔ اگر قرآنِ کریم کا فکری طور پر سمجھ لینا' انسان کی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو اس فکری کاوش کا کچھ فائدہ نہیں۔ اگر آپ کسی نسخہ کے اجزاء کے خواص و اثرات کا پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ لیکن اسے استعمال کر کے اپنے مرض کا ازالہ نہیں کرتے۔ تو اس نسخہ کے متعلق آپ کی یہ معلومات آپ کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے۔ میرا مقام داعی کا نہیں' ایک مبلغ کا ہے۔ اس لئے میں دوسروں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو حضرات قرآنی فکر کو ذہنی عیاشی سے آگے نہیں بڑھاتے' انہیں اس خود فریبی سے ضرور نکالنا چاہتا ہوں کہ اگر اس فکر سے آپ کے کردار میں بلندی اور سیرت میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی تو آپ اس کاوش میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ آپ کا مستقبل آپ کے علم سے نہیں' اخلاق سے سنورے گا۔ یوں بھی جس کا کردار پاکیزہ نہیں۔ وہ زندگی کو کماحقہٗ سمجھ بھی نہیں سکتا۔ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾ (56:79)۔ اس کے لئے خدائی سند موجود ہے کہ

جس کے قلب ونگاہ میں پاکیزگی نہیں اسے قرآن سے کیا مس ہوسکتا ہے یہ وہ متاع گراں بہا ہے جس کا متلاشی اسی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ

ہم دل کا دیا جلا کے لائے تب جا کے ترا سراغ پایا

اگر آپ کے ''دل کا دیا'' نہیں جل رہا تو آپ کے ماتھے کی آنکھوں کی بصارت آپ کو راستہ نہیں دکھا سکتی۔ اور دل کے دیئے کی لو کا مظاہرہ انسان کی سیرت وکردار سے ہوتا ہے اسی لو سے اس کی اپنی زندگی کی راہیں روشن ہوتی ہیں اور یہی دوسروں کے لئے بھی قندیلِ راہ بنتی ہے۔

محترم پرویز صاحب نے اپنی خطاب میں تحریکوں کے عروج وزوال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

آخر میں' میں آپ کو اس مہیب اور خطرناک لیکن (بظاہر) بڑی خوشنما اور دیدہ زیب چٹان کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں' جس سے ٹکرا کر دنیا کی بڑی بڑی تحریکوں کی کشتی پاش پاش ہوجاتی ہے اور ہوگی۔ ایک داعیٔ انقلاب ایک پیغام دیتا ہے کہ اس تحریک کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ وہ پیغام صاف' واضح اور متعین ہوتا ہے۔ جب تک وہ تحریک اس پیغام کے ساتھ وابستہ رہتی ہے' زندہ اور متحرک رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں دنیا سمجھتی ہے کہ وہ اس بانیٔ تحریک کے بہت قریب تھے' بہت سی باتیں اس کی طرف منسوب کرکے ان کا چرچا عام کردیتے ہیں۔۔۔ نتیجہ اس کا یہ کہ رفتہ رفتہ' اس داعی کی طرف منسوب کردہ روایات' اصل پیغام کی جگہ لے لیتی ہیں اور یوں وہ تحریک کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔

مجھے عزیزانِ من! کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں' تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں' خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں' اور منسوب کردیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوعِ اسلام کی طرف۔ وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ' دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لئے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں' نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

طلوعِ اسلام کی بارہویں سالانہ کنونشن 17 تا 19 اکتوبر 1969ء لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس میں ''شرارِ زندگی'' کے

عنوان سے محترم پرویز صاحب نے مندوبین کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا:

راستہ کی ان خطرناک گھاٹیوں کی نشاندہی کرانے کے بعد' رفقائے محترم! یہ احساس میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھرتا ہے کہ میں آپ کی اُن مساعیٔ جمیلہ کے لئے آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کروں جو آپ کی طرف سے سال بھر میں قرآنی فکر کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ظہور میں آئی ہیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے' ہماری تحریک سرمایہ داروں کی تحریک نہیں۔ نہ ہی اسے کہیں سے کوئی امداد ملتی ہے ___ جو تحریک ہر غلط بات کو غلط کہہ دے' اور لگی لپٹی بغیر پکار کر کہہ دے' اُسے اِس زمانے میں امداد کہاں سے مل سکتی ہے؟ ہماری تحریک سے وابستہ حضرات اُس طبقہ سے متعلق ہیں جسے عرفِ عام میں متوسط (یا سفید پوشوں کا) طبقہ کہا جاتا ہے۔ لیکن' اِس زمانے میں دیانتدارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی آمدنی کی محدودیت' اور اشیائے صرف کی ہوش ربا گرانی نے اس طبقہ کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ اب ملک میں عملاً دو ہی طبقے رہ گئے ہیں ___ اوپر کا طبقہ جو اُن چند گھرانوں پر مشتمل ہے جن میں دولت اُمنڈ کر آ گئی ہے' اور نچلا طبقہ جو کسی نہ کسی طرح' مرتے بھرتے زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ ہماری تحریک سے دلچسپی رکھنے والے اس دوسرے طبقہ سے متعلق ہیں ___ اور قرآنی شہادت کے مطابق' آسمانی انقلاب کی دعوت پر لبیک' سب سے پہلے ہوتی بھی اسی طبقہ کی طرف سے ہے ___ لہٰذا ہمارے ذرائع لامحدود کیسے ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کا جذبۂ صادقہ اور قابلِ رشک ہمت ہے جو اس قدر حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنا پیٹ کاٹ کر' اس قرآنی دیئے کے لئے تیل' بتی کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ احباب کے اس ایثار کی میرے دل میں بڑی قدر ہے اور میزانِ خداوندی میں اس کا بڑا وزن۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمتوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کے درخشندہ نتائج کا تجزیہ فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے کہا:

قرآن کے پیغامِ انقلاب آور کی نشر واشاعت کے لئے' آپ کی سالہا سال کی نہایت خاموش اور (بظاہر) بڑی سست خرام جدوجہد نے کیا نتائج پیدا کئے ہیں' اس کا تصور ہم خود بمشکل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم' پانی کے اندر غوطہ زن ہیں اس لئے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اس کی بابت اُس سے پوچھنا چاہئے جو ندی کے کنارے کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ وہ ہمیں بتائے گا کہ جب ہم نے آج سے تیس سال پہلے یہ آواز بلند کی تھی تو ہمارے ہاں قرآنِ کریم کا مصرف' تلاوت برائے حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ لیکن آج ہر طرف سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ قرآنِ کریم ایک مکمل ضابطۂ ہدایت ہے جو ہر زمانے میں اور انسانی زندگی کے ہر گوشے میں' نوعِ انسانی کا خضرِ راہ بن سکتا ہے۔

میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں' زمیلانِ محترم! کہ اتنے مختصر سے عرصہ میں' جو قوموں کی زندگی میں لمحہ بھر سے زیادہ نہیں' اس بے سروسامانی کے باوجود' ایک پورے ملک ہی میں نہیں' بیرونِ ملک تک کی فضا میں اس قدر انقلاب پیدا کر دینا' کچھ کم کامیابی ہے؟ میں تو عزیزانِ من! جب اس تبدیلی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو والہانہ طور پر میری کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

مری نگاہ نے جُھک جُھک کے کر دیئے سجدے جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

اور میں تو' بکمال عجز و نیاز بطورِ تحدیثِ نعمت' یہاں تک کہنے کی بھی جرأت کر سکتا ہوں کہ صدرِ اوّل کے بعد' ہماری تاریخ کے کسی دور میں بھی' خالص فکرِ قرآنی کا اس قدر عالمگیر چرچا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کیا آپ' محبانِ گرامی قدر! اپنی اس سعادت کو وجہِ صد ناز و باعثِ ہزار افتخار نہیں سمجھتے کہ جب' میدانِ حشر میں' حضور نبی اکرم ﷺ بدرگاہِ ایزدی' یہ لرزہ انگیز شکایت کریں گے کہ: یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا (25:30)۔ ''اے میرے نشوونما دینے والے! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ایک شئے مہجور بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔'' تو آپ کا شمار اُس قوم میں نہیں ہوگا جس کی طرف حضور ﷺ کی انگلی اُٹھے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ہزار کامرانیاں اور سرفرازیاں اس ایک استثناء پر نثار کی جا سکتی ہیں۔

لہٰذا' برادران! آپ ان تمام ہنگامہ خیزیوں اور شورش انگیزیوں سے صرفِ نظر کر کے' اپنی ان خاموش سرگرمیوں میں' اس یقینِ محکم کے ساتھ منہمک رہیں کہ اس وقت ساری دنیا میں صرف آپ کی یہ مختصر سی جماعت ہے جو پیغامِ خداوندی کی مئے بے درد و صاف کو شفاف اور بے رنگ پیمانوں میں پیش کر رہی ہے۔

طلوعِ اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن 23 تا 25 اکتوبر 1970ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس موقع پر اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب نے جو خطاب فرمایا۔ اس کا عنوان تھا ''سکونِ گہر'' اسلامی سوشلزم۔ اور کسی ایک فرقہ کی فقہ کے نفاذ و عمل کے مطالبات کا تجزیہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے فرمایا:

اگر اس تحریک' اور تحریک کے داعیان اور متبعین کے لئے' جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ اقامتِ دین کی اصطلاح سے متعارف ہوں اور خواہ اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم۔ کہ اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرنے کا حق صرف اس تحریک کو ہو سکتا ہے جس کی بنیادیں اس ایمان پر استوار ہوں جسے قرآن نے ہر عملِ صالح کی اولین شرط قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک' ایمان کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ اصطلاحی مسلمانوں سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ۔۔۔ (4:136)۔ ایسے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں' ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر' اور اس کتاب پر جو اس نے اپنی رسول پر نازل کی ہے۔ مسلمانوں سے ایمان لانے

کے مطالبہ سے مراد ہی یہ ہے کہ اپنا یا اپنے تحریکوں کا نام اسلامی رکھ کر اس فریب میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ ہم مومن ہو گئے ہیں اور ہماری تحریکیں فی واقعہ اسلامی۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھی اس فریب میں مبتلا رکھے چلے جا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ فریب دیئے جا رہے ہیں کہ محض چند الفاظ کی تبدیلی سے مملکتیں اور تحریکیں اسلامی بن جاتی ہیں۔ جب پاکستان اسمبلی نے قرار دادِ مقاصد پاس کی تھی تو جماعت اسلامی نے اعلان کر دیا تھا کہ اب مملکت مسلمان ہو گئی ہے' اور اب وہ یہاں' کسی ایک فرقہ کی فقہ نافذ کر دینے سے یہ احساس دلا رہی ہے کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح کچھ' دوسرے لوگ یہ سمجھ اور سمجھا رہے ہیں کہ موجودہ معاشی نظام کے ڈھانچے کی جگہ ایک دوسرے نظام کا ڈھانچہ قائم کر دینے سے' ملک میں اسلامی نظامِ معیشت رائج ہو جائے گا۔ طلوعِ اسلام نہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے' اور نہ ہی ان حضرات کو جو اس تحریک سے وابستہ ہیں یا اس سے متفق' اس التباس میں مبتلا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان حضرات سے' جو ملک میں مختلف تحریکوں کے داعی ہیں یہ گذارش کرنا چاہتا ہے کہ وہ موجودہ نظامِ مملکت میں جس قسم کی میکانکی تبدیلی لانا چاہتے ہیں' اس کے لئے وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو چاہیں کریں۔ لیکن اپنی تحریکوں کو اسلامی کہہ کر نہ پکاریں اس لئے کہ اس سے علاوہ دیگر امور' ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جب ان کا نظام' ناکام رہے گا تو (جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے) دنیا یہ کہے گی کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ نوعِ انسان کو کوئی محکم نظام دے سکے۔

باقی رہے وہ گرمجوش حضرات (جو بیشتر نوجوانوں کے طبقہ پر مشتمل ہیں اور) جو ان ہنگامی تحریکوں میں شامل ہو کر اپنے تند و تیز جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا چاہتے ہیں وہ ان میں شوق سے شامل ہوں۔ لیکن یہ کہہ کر اپنے آپ کو یا دوسروں کو مبتلائے فریب نہ کریں کہ وہ تحریک' اس اسلامی نظام کے حصول کے لئے عملی اقدام ہے جس کی دعوت طلوعِ اسلام دیتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت' جو قلب و نگاہ کی تبدیلی کی دعوت ہے' پہلے بھی ملک کی دیگر تحریکات سے الگ اور منفرد دعوت تھی' اور آج بھی اسی طرح الگ اور منفرد دعوت ہے جہاں تک بزم ہائے طلوعِ اسلام کے ارکان کا تعلق ہے، دستورِ اساسی کی رُو سے' کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا اور طلوعِ اسلام عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔۔ طلوعِ اسلام کی تحریک' فکری تحریک ہے۔ یہ شروع ہی سے فکری تھی اور جوں جوں ہنگامی تحریکوں کے تجربات سامنے آتے جاتے ہیں' یہ حقیقت نمایاں تر ہوتی جاتی ہے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے' ہنگاموں سے نہیں۔ اس سے ہمارا یقین اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ طلوعِ اسلام کی تحریک حق و صداقت پر مبنی ہے۔

طلوعِ اسلام کی چودھویں سالانہ کنونشن 25 تا 28 نومبر 1971ء گلبرگ لاہور ہی میں منعقد ہوئی اس موقع پر اراکین

بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب نے ''نالۂ بیباک'' کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

میں نے بھی احبائے من! اپنے وقت کے مختلف تغیرات کو جو خوش آئند قرار دیا تو اسی لیے کہ میری قرآنی بصیرت میری رہنمائی اس طرف کر رہی تھی کہ زمانے کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو قرآنِ کریم کی منزل اولین۔ یعنی حصۂ لا۔ کا تقاضا پورا کرنے میں بڑی حد تک معاون ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اگر یہ تغیرات' قرآنی نظام کی رُو سے لائے جاتے تو لا اور الا۔ (تخریب وتعمیر) کا پروگرام ساتھ کے ساتھ روبہ عمل ہوتا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں نے' جو اس کتابِ عظیم کے وارث ہونے کے مدعی ہیں' تغافل مجرمانہ برتا اور اپنے خود ساختہ اسلام کو ''دینِ خداوندی'' سمجھ کر كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ (23:53)۔ کی عبرتناک تصویر بنے بیٹھے رہے' اس لئے ''گردشِ زمانہ'' نے اپنا عمل جاری رکھا اور اپنی ضرباتِ پیہم سے ہر اس نظام کو پاش پاش کر دیا۔ جو اس کی راہ میں روڑے اٹکاتا پھرتا تھا۔ اس لئے یہ تغیرات لا کی وادی تک محدود رہے۔ میری کوشش یہ رہی ہے کہ انسانی فکر کی راہنمائی' قرآن کی متعین کردہ' منزل الا کی طرف کئے جاؤں تاکہ یہ تخریب' بلاتعمیر نہ رہ جائے۔ میں چونکہ اتوار کی صبح کے اپنے خطاب میں جس کا عنوان ہے'' اسلامی سوشلزم'' اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ اس لئے اس وقت انہی ارشادات پر اکتفا کیا جاتا ہے بہرحال یہ ہے تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصود ومطلوب۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہماری اس سعی وکاوش کی مخالفت ہر رجعت پسند قوت کی طرف سے ہوگی جو دین کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے' اس لئے کہ وہ قوتیں اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کے مجنونانہ طوفانوں کے مقابلے میں' جو راستے کی رکاوٹوں کے صرف بالائی حصے کو مسمار کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں' ان کے لئے یہ فکری انقلاب زیادہ خطرناک ہے جو ان کے خود ساختہ مفاد پرستانہ نظام کی بنیاد کو اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ ہمارے ہاں کی مذہب پرست جماعتیں' ہر اس پارٹی کے ساتھ مفاہمت کے لئے تیار ہو جاتی ہیں جنہیں یہ ایک وقت میں ملحد اور بے دین قرار دیتی ہیں لیکن آپ کی تحریک کی مخالفت میں کبھی کمی نہیں کرتیں۔۔۔ یہ ہماری قوم کی بدبختی اور نوعِ انسان کی حرماں نصیبی کہ ان اسلام دشمن عناصر نے طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کو اس قدر ہوا بنا دیا کہ اچھے اچھے مخلص اور سمجھدار لوگ بھی اس سے متفق ہونے کے باوجود' اس کی طرف کسی قسم کی نسبت سے گھبرانے اور کترانے لگ گئے۔ یہ ہوتا ہے پروپیگنڈا کا اثر۔

ان حالات میں سوچئے! رفیقانِ من! کہ کس قدر خوش نصیب ہیں وہ جو اس کاروانِ رشد وہدایت کے ہم سفر ہوئے اور راستے کے ہر خطرہ کا مقابلہ کرتے ہوئے' برابر ساتھ چلتے آئے۔ اور ساتھ چلے جا رہے ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ آپ احباب کے حوصلوں میں برکت اور عزائم میں استقامت عطا فرمائے کہ آج سارے عالمِ

اسلام میں پیغامِ قرآنی کے علمبردار آپ کے سوا کوئی نہیں۔ کتنی بڑی ہے یہ سعادت جو مبداءِ فیض کی کرم گستری نے آپ کو ارزاں فرمائی ہے اور آپ سے کہیں زیادہ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں جسے آپ جیسے مخلص، مشفق، غم گسار، رفیقانِ سفر میسر آئے ہیں میں خدائے کائنات کی اس موہبتِ کبریٰ پر جس قدر بھی سجدہ ریز ہوں کم ہے۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو خوش وخرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند وطیب مقصد میں کامیابی وکامرانی عطا فرمائے۔''

طلوعِ اسلام کی پندرہویں سالانہ کنونشن 23 تا 26 نومبر 1972ء، 25 بی گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی ''معرکۂ دین وطن'' کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

''اس معرکۂ دین وطن میں ہمارا پروگرام بھی نیا نہیں ہوگا۔ ہم نے عملی سیاسیات میں حصہ لینا ہے نہ ہنگامے برپا کرنے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر نہ کسی سے ٹکراؤ ہے، نہ الجھاؤ، ہم نے اپنے معمول ودستور کے مطابق قرآنی فکر کو نہایت امن وسکون کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حد تک عام کرتے جانا ہے۔ اسی طریق سے ہم نے پہلے میدان مارا تھا۔ اسی سے اب ہمیں بفضلِ ایزدی کامیابی وکامرانی حاصل ہوگی۔ آپ اسی روشِ قدیم کے مطابق، اس کی ابتداء کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اندھیرے کس طرح چھٹتے اور روشنیاں کس طرح بڑھتی ہیں۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ملک کی بڑی بڑی تنظیمیں، جن کے ہاں زر وسیم کا سیلاب امنڈے چلا آتا ہے، ہماری اس بے سروسامانی پر ہنستی ہیں اور کہتی ہیں کہ۔۔۔ ذرۂ ناچیز و بیابانے نگر۔ لیکن آپ ان سے پوچھئے کہ اس بے پناہ ساز وسامان کے باوجود ان کے نامۂ اعمال میں سوائے تخریبات کے اور ہے کیا؟ آپ عزیزانِ من! ان مخالفوں کی باتوں پر نہ جایئے۔ آپ کا جنونِ شوق، ان کے ہزار مادی ساز وسامان سے زیادہ گراں قدر اور نتیجہ خیز ہے۔

کہے زمانہ جو دیوانہ، کوئی بات نہیں اٹھاؤ ہاتھ میں پیمانہ، کوئی بات نہیں

طلوعِ اسلام کی سولہویں سالانہ کنونشن 22 تا 25 نومبر 1973ء کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب نے ''غلامی سے بتر ہے بے یقینی'' کے عنوان سے خطاب فرمایا۔ ملک میں چھائی ہوئی یاس وناامیدی کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

آپ کو معلوم ہے کہ ''ابلیس'' کے معنی مایوس ہیں۔ کسی قوم کو تباہ کرنے کے لئے اس کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں مایوسی کو عام کر دیا جائے۔۔۔ اس وقت ہماری قوم ابلیس کے اس حربہ کا شکار ہو رہی ہے۔ دانشورانِ قوم اس ہمہ گیر مایوسی کا سبب معلوم کرنے کے لئے سرگرداں دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کی نگاہیں کسی نہ کسی ہنگامی اور قریبی حادثہ پر جا کر رک جاتی ہیں۔ اس کے حقیقی اور بنیادی سبب تک نہیں پہنچ پاتیں۔

وہ علاماتِ مرض کو دیکھتے ہیں۔ علتِ مرض ان کے سامنے نہیں آتی۔ علتِ مرض' عزیزانِ من انہی کے سامنے آسکے گی جو قرآنی روشنی میں اس کی تلاش کریں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد کہا تھا کہ ہمیں یہ مملکت' قوم کی فکری صلاحیتوں کی بنا پر نہیں ملی۔ یہ چند اتفاقی اسباب کے جمع ہونے کا نتیجہ ہے جو ملت کے رہبرِ فرزانہ قائداعظمؒ کے حسنِ تدبر و خلوص کی بناء پر ہمارے حق میں مرتب ہوگیا۔ یہ مملکت تو ہمیں اس طرح مل گئی۔ لیکن یہ کبھی مستحکم نہیں رہ سکتی جب تک قوم کے دل و دماغ میں صحیح فکری انقلاب پیدا نہیں ہوگا۔ یہ تنبیہہ میری اپنی فکری تخلیق نہیں تھی یہ قرآن کا پیغام تھا جسے میں نے قوم تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو! اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (13:11)۔ خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔۔۔ قوم اس دور دراز راستہ پر گامزن ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی اور ہنگامہ آرائیوں میں الجھ گئی۔ لیکن ہنگامہ آرائی کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قوم تو ایک طرف۔ خود آپ کی تحریک میں عجلت سے شامل ہوجانے والے کئی گرم رَو نوجوان یہ کہہ کر آپ سے الگ ہوگئے کہ یہ سُست رفتار بے عملوں کی تحریک ہے۔ زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے آپ جب تک قوم میں فکری اور نفسیاتی تبدیلی پیدا کریں گے۔۔۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔۔۔ چنانچہ گرم جوش رَہرو' بغیر فکری انقلاب' ہنگامہ آرائیوں کے راستے پر گامزن رہے اور' مستحق ہزار تبریک و تہنیت ہیں آپ احباب' کہ آپ نے اس راستے کی ہزار دلفریب جاذبیتوں کے باوجود' اپنی پرسکون راہ کو نہ چھوڑا۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی رہی کہ۔ تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے اور آپ اسی رفتار سے آگے بڑھتے چلے گئے۔۔۔ میں نے عزیزانِ محترم' اس پیدا ہونے والی کیفیت کی نشاندہی' آج سے تین سال پہلے' اسی مقام پر' اسی کنونشن (منعقدہ 1970ء میں) اپنے اس خطاب میں کردی تھی جس کا عنوان تھا'' قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں''۔۔۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف میں قوم کو دعوت دیئے چلا آرہا ہوں اور جس کی وجہ سے میں مذہب پرست طبقہ کی طرف سے مطعون قرار دیا جارہا ہوں لیکن جس حقیقت کو میری نگہِ بصیرت نے بے نقاب دیکھ لیا ہے میں ان کی مخالفت کی وجہ سے۔۔۔ اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور یہی ہے برادرانِ من! تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد و منتہیٰ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری تحریکِ ان اربابِ ہمت پر مشتمل ہے جن کے وسائل نہایت محدود ہیں۔ ہمیں کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد حاصل نہیں' نہ ہی اس کی توقع کی جاسکتی ہے کیونکہ قرآنی انقلاب' ہر نوع کے مفاد پرستوں اور طالع آزماؤں کے لئے پیامِ مرگ ہے اس لیے اس تحریک کی امداد کون کرے گا؟ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ آپ احباب اس میں پہلے ہی اپنی بساط سے

کہیں بڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس سے بھی زیادہ ہمت سے کام لیں اور قرآنی پیغام کے عام کرنے میں زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

طلوعِ اسلام کی سترہویں سالانہ کنونشن 24 تا 27 اکتوبر 1974ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی۔ جس میں محترم پرویز صاحب کے استقبالیہ کا عنوان تھا ''میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے'' بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اراکین سے خطاب فرماتے ہوئے موصوف نے فرمایا:

''آخر میں میرا روئے سخن پھر اپنے قرآنی احباب کی طرف ہے۔ ہم نے عزیزانِ من! اس آواز کو اس زمانے میں اٹھایا جب ہمنوائی تو ایک طرف اس کی صدائے بازگشت بھی کہیں سے سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے برعکس اس کی مخالفت اس شدت سے ہوئی کہ اس کا بڑھنا یا اثر انداز ہونا تو ایک طرف اس کے زندہ رہنے کے بھی بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے بعض ہم سفر اس کی نتیجہ خیزی کی طرف سے مایوس ہوکر الگ ہوگئے۔ بعض اس کی سُست رفتاری کی وجہ سے تھک کر بیٹھ گئے۔ بعض شارٹ کٹس (پگ ڈنڈیوں) کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکل گئے لیکن میں آپ احباب کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ مخالفتوں کے اس تمام ہجوم اور نامساعد حالات کے اژدھام کے باوجود آپ کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی۔ اور آپ اس ننھے سے دیئے کو چراغِ راہ بنائے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ سب اس یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا نتیجہ ہے کہ دُھند چھٹ رہی ہے۔ تاریکیاں کافور ہو رہی ہیں اور نشاناتِ منزل ابھرے ہوئے دکھائی دینے لگ گئے ہیں۔

آپ ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے کہ 1935ء میں بہاولپور کی ایک ریاست نے میرے مقالہ پر مبنی یہ فیصلہ دیا تھا کہ مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والے دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ میں نے اپنی اس آواز کو غیر منقسم ہندوستان میں بھی جاری رکھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی اسے دہراتا چلا گیا کہ یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا فرق متعین کرے اور ختمِ نبوت کو ان دونوں میں حدِ فاصل قرار دے۔ آج چالیس سال کے بعد اس مطالبہ کو حکومت کی طرف سے تسلیم کیا گیا چالیس سال کا عرصہ تھوڑا عرصہ نہیں ہوتا۔ یہ تو انسان کی طبعی زندگی کا نصف سے بھی زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ میری نصف زندگی اس میں صرف ہوگئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری ساری زندگی بھی اس میں صرف ہوجاتی اور آخری سانس میں بھی یہ نشیدِ جانفزا میرے کان میں پڑ جاتی تو میں شاداں وفرحاں' یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوتا کہ۔ شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم۔ تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ میرے ایمان کا تقاضا' میرے عشق کا مطالبہ' اور میری زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اس میں میری کامیابی کچھ کم نہیں۔ لیکن یہ تنہا میری کامیابی نہیں۔ آپ تمام احباب کی کامیابی

ہے۔ اگر مجھے آپ کی رفاقت میسر نہ آتی تو میں تنہا اس طول طویل راستے کو بمشکل طے کر سکتا۔ الحمد للہ علی ذالك اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور میں جب کسی تحریک کی کامیابی کے لئے بڑے بڑے وسیع پیمانے پر اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں یہ کامیابیاں اس بے سروسامانی کی حالت میں نصیب ہو رہی ہے' تو میرا سر نیاز بارگاہِ مسبب الاسباب میں اور بھی زیادہ خشوع و خضوع سے جھک جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام کی اٹھارہویں سالانہ کنونشن 23 تا 26 اکتوبر 1975ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس کنونشن میں محترم پرویز صاحب کے استقبالیہ کا عنوان تھا ''حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں'' حق و باطل کی طویل کشمکش کا جائزہ لیتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اب میرا روئے سخن' بالخصوص کاروانِ قرآنی کے اپنے ہمسفر رفقاء کی طرف ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آپ کس قدر عظیم فریضہ کو لے کر اٹھے ہیں۔ آپ قابلِ صد مبارک باد ہیں کہ آپ ستائش کی تمنا اور صلہ کی اُمید کے بغیر' اور اس کے برعکس' ہر قسم کے طعن و تشنیع اور جھوٹے الزامات کے تیر و نشتر کے ہدف بننے کے باوجود گذشتہ بیس پچیس سال سے اس فریضہ کی ادائیگی میں اپنی بساط کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں۔ اس سلسلہ میں' میں اس تنبیہہ کو دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں' جو اس سے پہلے بھی متعدد بار آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کے قول اور عمل سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جو اُمت میں تفرقہ کا موجب ہو۔ تفرقہ انگیزی قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے مطابق شرک ہے۔۔۔ تفرقہ ایسا عظیم جرم ہے جس کے نتائج نسلوں تک متعدی چلے جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے جو میں شروع سے یہ تاکید کرتا چلا آ رہا ہوں کہ آپ اس فکر کو عام کیجئے۔ لیکن کوئی فرقہ یا پارٹی یا جداگانہ جماعت بنائے بغیر۔ آپ کی بزموں کی حیثیت بھی ایک تنظیمی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ جس قرآنی فکر کو عام کرتے ہیں' اس کی تردید میں کسی کو ایک لفظ بھی زبان پر لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ وہ مبنی بر سند و حجت ہوتی ہے۔

ایک اور ضروری بات بھی آپ احباب کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں متعدد احکام و ہدایات ایسے ہیں جنہیں ہم انفرادی طور پر بجالا سکتے ہیں اور ان کی بجا آوری ہماری سیرت و کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن بعض احباب کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ اس پر عمل اس وقت ہوسکتا ہے' جب اسلامی نظام قائم ہو۔ ایسا کہنا اگر فریب دہی نہیں' تو خود فریبی ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے مہمات اور بھی ہیں جن کی سرانجام دہی اسلامی نظام ہی میں ممکن ہے لیکن جن امور پر موجودہ حالات میں بھی انفرادی طور پر عمل ہوسکتا ہے' ان پر عمل پیرا نہ ہونا ہمارے کردار کی خامی اور سیرت کی ناپختگی ہے' میں ان میں سے چند ایک قرآنی ہدایات کی نشاندہی کرتا ہوں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان پر بحالت موجودہ عمل پیرا کیوں نہیں ہوا جا سکتا۔ مثلاً

قرآنِ کریم میں ہے (1) اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ (2) معاہدوں کی پابندی کرو۔ (3) بات غیر مبہم، صاف، واضح اور دوٹوک کرو۔ (4) ایسی باتیں کرو جو حسن کا پہلو لئے ہوں۔ (5) دوسروں کی عیب جوئی کے لئے ان کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔ (6) لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ (7) ان کے بُرے بُرے نام نہ رکھو۔ (8) غیبت نہ کرو۔ (9) یونہی اکڑتے نہ پھرو۔ (10) افواہوں پر یقین نہ کرلیا کرو۔ ان کی خود تحقیق کرلیا کرو۔ (11) لغویات سے پرہیز کرو۔ (12) راستہ چلتے ہوئے اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیا کرو اور ہر قسم کی بے حیائی اور فحاشی سے بچو۔ (13) بدظنی سے پرہیز کرو۔ (14) یونہی غصہ میں مشتعل نہ ہو جایا کرو۔ (15) جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑائیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ (16) بوڑھے والدین سے حسن سلوک سے پیش آؤ۔ (17) گھر کی زندگی کو خوشگوار رکھو۔ (18) جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں ان کی عزت اور دل جوئی کرو۔ (19) اگر تم کسی محتاج کی حاجت روائی کرنے کے قابل نہ ہو تو اس سے کم از کم نرم خوئی کا برتاؤ کرو۔ (20) غور و فکر کی عادت ڈالو۔

میں نے قرآنِ کریم کی اخلاقی ہدایات میں سے یہ چند ایک مثال کے طور پر پیش کی ہیں آپ فرمایئے کہ ان میں سے کون سی بات ہے جس پر بحالتِ موجودہ انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جا سکتا؟ آپ سے میری التماس ہے کہ آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کردار کا بھی خیال رکھیں اور حق تو یہ ہے کہ فکری پیش کش بھی اسی کی مؤثر ہو سکتی ہے۔ جس کا کردار قابل اعتماد ہو۔ جو بھرے مجمع میں کہہ سکے کہ میں نے تم میں اپنی عمر گزاری ہے۔ تم اس سے اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میرے عزیز رفیقو! زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو معمولی نہ سمجھو۔ کیریکٹر کی تو پہچان ہی روزمرہ زندگی میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے امور سے ہوتی ہے۔

محترم پرویز صاحب نے کہا:

واضح رہے کہ میں نہ کسی جماعت کا امیر ہوں نہ کسی فرقہ کا امام ہوں، نہ کسی سلسلۂ تصوف کا مقتداء۔ جو آپ احباب سے حکماً کچھ کرا سکوں۔ یا آپ کا مؤاخذہ کر سکوں۔ میں تو آپ ہی میں سے ایک ہوں اور جو کچھ آپ سے کہتا ہوں۔ وہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (103:3) کی ذیل میں آتا ہے۔ یعنی رفقائے کار کا ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین کرتے رہنا۔ اس توصیہ کے بعد میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ دنیا کے طعن و تشنیع اور جھوٹی الزام تراشیوں اور بہتان بازیوں کی پروا کئے بغیر، اپنے اوپر خود عائد کردہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرگرمِ عمل رہئے۔

طلوعِ اسلام کی انیسویں سالانہ کنونشن 21 تا 24 اکتوبر گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس موقع پر محترم پرویز صاحب کے

استقبالیہ خطاب کا موضوع تھا'' آدمِ نو کی تخلیق''1976ء کے بعد ملک کے حالات نامساعد رہے اس لئے طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن منعقد نہ ہو سکے۔ یوں سمجھئے کہ اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب کا یہ آخری خطاب تھا اس لئے خصوصی طور پر ہم سب کے لئے توجہ کا مستحق ہے۔تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد بیان فرماتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے کہا:

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد' عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقینِ محکم حاصل ہو کہ انسانی مشکلات کا حل' قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جو اس مقصد کو دل میں لئے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں' اور اس غرض کے لئے اس اجتماع میں شریک ہوتے ہیں کہ اس تحریک کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ مزید کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوشش بڑی مستحسن ہیں۔لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔قرآنِ کریم محض فکری وحدت کو کافی قرار دے نہیں سکتا۔اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص فطری طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کرے گا وہ اس روپ میں شامل ہو جائے گا۔لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی جسے قرآن فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (3:103)۔ سے تعبیر کرتا ہے۔یعنی دلوں کا آپس میں جُڑ جانا اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر' آپ کے احساسات وجذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھئے! تنہا فکر' عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔عمل کے محرک' جذبات واحساسات ہوتے ہیں۔ جب مختلف افراد کے جذبات' ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے تو ان کے اندر وحدتِ کردار وعمل پیدا ہو گی۔اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ۔۔۔وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام۔۔۔اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں' حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخِ تہذیب (J.H.Denison) نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔۔۔(Emotion as the Basis of Civillization)۔اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع میں اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔اس کتاب کے مقدمہ میں (George Foot Moore) لکھتا ہے۔

'' تہذیب کا نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرے۔اس قسم کا اتحاد' تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا یہ اتحاد وحدتِ جذبات و

احساسات سے ممکن ہوتا ہے جن سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔''

میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم میں (یعنی جنہوں نے اس تحریک سے وابستگی اختیار کی ہے ان میں قدر مشترک یا وجہ پیوستگی' فکری وحدت ہے' اور ہماری غلط نگہی یہ کہ ہم نے اس کو کافی سمجھ لیا ہے۔ ہم میں جذبات واحساسات کی وحدت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں بھی (دوسرے لوگوں کی طرح) اکثر باہمی نزاعات ابھرتی رہتی ہیں' حالانکہ جذباتی وحدت میں کسی قسم کی نزاع کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ جو قرآنِ کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ (9:71)۔ وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں' تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت سے آپ میں' گھڑی کے پرزوں کی طرح' میکانکی تعاون تو پیدا ہو جائے گا۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ (9:71) کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ گھڑی کے پرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی' بلکہ وہ گھِس کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء پیدا نہیں ہوتا فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اسی قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ انسان کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے' اس کے متعلق مشہور روسی مفکر' اوسپنسکی لکھتا ہے کہ:

انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں۔ (Tertium Organum. P-200)۔ وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہتا ہے کہ آپ دیکھئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں کیونکہ برگِ حشیش ان سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے' ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں اور دوسرے ان میں' انسانی فکر معطل اور مسلوب ہو جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب ان کا نشہ اتر جاتا ہے تو پھر حسب سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہو جاتے ہیں لیکن قرآنِ کریم' جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم آہنگ کرتا ہے' ان میں یہ نقص نہیں ہوتا۔۔۔ نہ وہ عارضی ہوتے ہیں' اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے' قرآنِ مجید' ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے' وہ کہتا ہے کہ اس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اولین خصوصیت یہ ہوگی کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (7:43)۔ ان کے دلوں سے غل نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غل) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معانی اور مفہوم

کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔ غل کے بنیادی معنی اس قسم کی گرہ سمجھ لیجئے اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف' کینہ' کدورت' حسد' انتقام' عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں' ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غل سے۔ جنتی معاشرہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غل نہیں ہوگا۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے گا۔ یہ گرہیں کھول دی جائیں گی۔۔۔ اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ (15:47) اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ وہ ''تختوں پر ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے۔'' لیکن لفظ سرر کا مادہ (س۔ر۔ر) ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (Face to Face) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ (25:75) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برعکس جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ۭ (38:59) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کے دلوں میں غل بھرا ہوتا ہے۔

اس غل کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' غل کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرین علم النفس (Psychologist) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز پیوست ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز' پھانس کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔۔۔ پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی اب ان' تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج' تجزیۂ نفس کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریقِ علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس

طریق سے کیا جاتا ہے' میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہیئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر' یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآنِ کریم کی اس آیہ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (7:43) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سرِ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ تعلقات' قرآنی رابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا رابطہ باہمی محض فکری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہو سکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بنا پر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں' آپ کا یہ رابطہ کس زمرے میں آتا ہے!۔۔۔ قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم و احساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور و خوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علیٰ وجہِ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ ؎

حرم کو چھوڑ کے پیرِ حرم کہاں جاؤں کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری رابطے سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں تو پھر سمجھئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے' ورنہ نہیں۔۔۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں۔ یاد رکھئے اپنے آپ کو ''حقیقی'' اور دوسروں کو ''پیدائشی'' مسلمان سمجھنا۔ یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا انسانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (53:32)۔ اپنے آپ کو یونہی مزکی نہ سمجھ لیا کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایغو کے اس قسم کے وَساوِس سے محفوظ رکھے۔ آپ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہیئے۔ جس سے دنیا خود اندازہ لگا سکے کہ آپ کیسے ہیں۔

فرقہ بندی نہیں:

آپ کی اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بغیر فرقہ بنائے دین کی طرف دعوت دیتی ہے یہ انداز سرسید (علیہ الرحمۃ) نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے بھی فرقہ بندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر اپنا کوئی فرقہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن فرقہ پرست اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے! وہ جو مشہور ہے کہ کسی نے کُبڑی سے پوچھا کہ تمہارا کُب دور ہو جائے یا سب کُبڑے ہو جائیں تو اس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ سب کُبڑے ہو جائیں۔ یہی حالت ہمارے فرقہ پرستوں کی ہے۔ سرسیدؒ نے ہزار چاہا کہ ان کُبڑوں کا کُب ٹھیک ہو جائے لیکن انہوں نے نہ مانا' اور اسے بھی کُبڑا بنا کر چھوڑا۔ سرسیدؒ نے قوانین فطرت (Laws of Nature) کے مطالعہ اور مشاہدہ پر زور دیا تھا۔ انہوں نے اسے ''نیچری'' کہنا شروع کر دیا اور اس سے نیچریوں کا ایک فرقہ بنا دیا۔ اور خوش ہو گئے کہ ہم نے انہیں بھی اپنے جیسا بنا دیا ہے۔ ان لوگوں نے یہی ٹیکنک آپ کی تحریک کے سلسلہ میں بھی اختیار کی ہے۔ ہمارے ہاں فرقوں کی باہمی سر پھٹول صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ ایک روایت کا حوالہ دے کر (جس میں کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ بنی اسرائیل میں بہتر فرقے تھے۔ میری اُمت میں تہتر فرقے ہوں گے جن میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا۔ باقی سب جہنمی) ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسرے فرقوں کو جہنمی ثابت کرنے کے لئے جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ طلوعِ اسلام نے پہلی بار یہ آواز بلند کی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے خود فرقہ سازی شرک ہے۔ اس میں' اس فرقے یا اس فرقے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس نے ایسا قرآنِ مجید کی نصوصِ صریحہ کی سند کے ساتھ کیا۔ (دیکھئے 30:31-32) اس کا جواب ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ انہیں بھی ایک فرقہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عالمِ خیال میں ایک فرقے کا وجود تخلیق کیا اور اسے پرویزی فرقہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ اس فرقے کا وجود خارج میں کہیں نہیں۔ صرف ان کے ذہنوں میں محبوس ہے اور ان کے جھوٹے پروپیگنڈا کی رُو سے مشہور۔ جو لوگ تحریکِ طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے متاثر یا اس سے وابستہ ہیں' ان کی نہ کوئی الگ مسجد ہے۔ نہ وہ دوسروں سے مختلف کوئی اپنی نماز پڑھتے ہیں۔ نہ ان کے پرسنل لاز علیحدہ ہیں۔ وہ ان تمام امور میں اُمت کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود' ہر محراب ومنبر سے پرویزی فرقہ' کا چرچا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بانی مودودی صاحب نے جو یہ ارشاد فرما دیا کہ زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے' تو اس نے ''خدا پرستوں'' کے لئے کذب وافترا کے سب دروازے چوپٹ کھول دیئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب' اپنے مخالف کے خلاف ''خدا اور رسول'' کے نام پر' ہر قسم کے جھوٹے الزامات تراشے جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اس کذب بافی پر کسی قسم کی ندامت ہو' اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ لیکن عزیزانِ من! اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ اس دنیا میں یہ خدائی فوجدار' دوسروں کے کفر وایمان کا فیصلہ کرنے کے لئے لاکھ مسندِ عدالت پر اپنے آپ کو فائز سمجھ لیں۔ عدالتِ خداوندی میں تو یہ سب' دوسروں کے ساتھ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ وہاں اگر اس ''خطا کار'' سے سوال ہوگا کہ تم ''حسبنا کتاب اللہ'' کہتے تھے تو بصد احترام عرض

کروں گا کہ ہاں حضور! کہتا تھا اور عمر بھر کہتا رہا!

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی

لیکن آپ یہ دیکھئے، رفیقانِ گرامی قدر! کہ ان لوگوں کی طرف سے اس قدر بے پناہ مخالفت، اور آپ کی اس قدر بے سروسامانی کے باوجود، آپ کے مشن کو کامیابی کس قدر ہوئی ہے؟ آپ تیس سال پہلے کی مذہبی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے۔ اور، جن احباب کی عمر زیادہ ہے، وہ اس زمانے کے وعظوں اور خطبوں کی یاد تازہ کریں۔ آپ کو ان میں، اور تو سب کچھ ملے گا، لیکن قرآن کا نام کہیں نظر نہیں آئے گا۔ لیکن آج کیفیت یہ ہے کہ نہ کوئی مذہبی رسالہ ایسا ملے گا نہ کوئی کتاب جس میں قرآنِ مجید کا نام نہ لیا گیا ہو۔ نہ کوئی محراب و منبر ایسا ہوگا جہاں اپنی بات کے ساتھ قرآن کی آیت نہ ضم کی جاتی ہو، اور نہ ہی کوئی اسٹیج جہاں اپنے دعوے کی نسبت اس کتاب کی طرف نہ کی جاتی ہو۔ خواہ وہ نسبت یا دلیل غلط ہی کیوں نہ ہو۔ حتیٰ کہ اب تو دبستانِ حکومت اور ایوانات پارلیمان تک میں اس کے تذکرے سنائی دینے لگے ہیں۔ سوچئے کہ اتنی بڑی تبدیلی کس کی قربانیوں کا صدقہ ہے۔ آپ بے نواؤں کی والہانہ کاوشوں کی، اس تبدیلی کی اس سے بھی زیادہ دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، ہمارے ہاں ہزار برس سے مذہبی فرقے چلے آرہے تھے۔ طلوعِ اسلام نے جو نصوصِ قرآنی کی رو سے بتایا کہ فرقہ بندی شرک ہے تو اس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑا۔ لیکن آپ کی اس بیباکانہ حق گوئی کا اثر یہ ہوا کہ یہ حضرات اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے شرمانے لگے چنانچہ اب ان کی طرف سے یہ آواز بلند ہونی شروع ہوگئی ہے کہ یہ فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں۔ ہر چند ان کی یہ خود فریبی یا فریب دہی، کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کے مترادف ہے، لیکن اس سے اتنا تو واضح ہے کہ آپ کی اس پکار سے یہ اپنے آپ کو فرقہ کہنے سے چھپنے لگے ہیں۔ یہ ہیں آپ کی دعوتِ الی القرآن کے وہ نتائج جو غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جارہے ہیں۔ آپ کے (یا بالفاظِ صحیح یوں کہئے کہ آپ کی قرآنی آواز کے) خلاف پھیلائی ہوئی تاریکیاں بظاہر بڑی دبیز اور وحشت انگیز نظر آتی ہیں۔ لیکن آپ کو ان کا کوئی اثر نہیں لینا چاہئے۔ جھوٹ کے تو پاؤں ہوتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ ؎

ظلمتِ شام سے اندازۂ انجام نہ کر! رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

اس کے بعد دو ایک ضروری تنبیہات، میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا کہ آپ کی صفوں میں ایسے لوگ گھستے چلے جارہے ہیں جو قرآن کے نام سے خلافِ قرآن خیالات پھیلاتے رہتے اور انہیں منسوب آپ کی طرف کرتے رہتے ہیں۔ میں نے متنبہ کیا تھا کہ آپ احباب ان سے خاص طور پر محتاط رہیں اور انہیں اپنے قریب نہ آنے دیں۔ اب انہوں نے ایک اور انداز اختیار کیا ہے۔ مجھے اکثر ایسے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں، جن میں لکھا ہوتا ہے کہ میں ایک عرصہ

سے طلوعِ اسلام، ترجمان القرآن یا بلاغ القرآن وغیرہ رسائل کا مطالعہ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ سب کی دعوت ایک ہی ہے۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میں جواب میں یہ کہا کرتا ہوں کہ اگر آپ واقعی نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو میرا آپ سے مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ جو جی میں آئے پڑھئے لیکن طلوعِ اسلام کا مطالعہ کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ ضائع نہ کریں۔ آپ کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ آپ طلوعِ اسلام کی دعوت کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس میں اور دیگر مذہبی رسالوں کی دعوت میں فرق کر سکیں۔ میری آپ احباب سے درخواست ہے کہ اگر آپ اپنی صفوں میں ایسے لوگوں کو دیکھیں تو انہیں اپنوں میں سے نہ سمجھیں۔ اگر وہ کسی سازش کے ماتحت ایسا نہیں کہتے۔۔۔ نیک نیتی سے ایسا سمجھتے ہیں تو بھی وہ غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی دعوت منفرد ہے اور، کوئی اور دعوت اس کے مماثل نہیں۔ طلوعِ اسلام اس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جو عہد مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ (48:29) میں نافذ تھا۔ دوسرے گوشوں کی طرف سے، اسلام کے نام پر اس مذہب کی دعوت دی جا رہی ہے جو ہمارے عہدِ ملوکیت میں وضع ہوا۔ طلوعِ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اسلام زندہ نظام (الدین) کی شکل صرف اسلامی مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ اسلامی مملکت کی عدم موجودگی میں، مذہب ہوتا ہے۔ دین نہیں ہوتا۔ اسلامی مملکت سے مراد ایسی مملکت ہے جس کا جملہ کاروبار خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ مذہب میں، قوانینِ شریعت (یعنی فقہی احکام افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں، خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ دین میں قانون سازی کا اختیار صرف مملکت کو ہوتا ہے اور اس کے مرتب اور نافذ کردہ قانون کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس طرح اس میں اُمتِ واحدہ ہوتی ہے، فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اور جب فرقوں کا وجود نہیں رہتا تو مذہبی پیشوائیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مذہب سرمایہ داروں کے بل بوتے پر زندہ رہتا اور پنپتا ہے۔ دین میں سرمایہ داری کی جڑیں تک کٹ جاتی ہیں۔ طلوعِ اسلام کی دعوت، موجودہ مذہبِ اسلام کی جگہ الدین کو متمکن کرنا ہے۔ یہ تبدیلی، اسلامی مملکت ہی کر سکتی ہے، افراد نہیں۔ لہٰذا طلوعِ اسلام الدین کی خصوصیت اور امتیازات تو پیش کرتا ہے، اُمت جس طرح شعار (نماز، روزہ وغیرہ) کی پابندی کرتی چلی آ رہی ہے، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ خود کرتا ہے، نہ کسی کو اس کا مجاز سمجھتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام کا اپنا کوئی الگ فرقہ نہیں۔ یہ ہے طلوعِ اسلام کی دعوت اور اس کا مسلک اور یہی ہے مجھ بے نوا کی وہ صدا جسے قرآن کے ایک ادنیٰ طالب العلم کی حیثیت سے، فریہ قریہ بستی بستی، بلند کئے چلا آ رہا ہوں۔''

بیادِ غلام احمد پرویزؒ

عبدالعزیز خالد

ہو گیا رخصت بساطِ تنگنائے دہر سے
دانش و بینش کا پیکر، پُر بہار و خوش صفات
اک ادارہ، ایک تحریک، اک مشن تھی جس کی ذات
طعنے گمراہی کے سنتا، وار بدنامی کے جو سہتا رہا
مہر خاموشی لگی خوفِ فسادِ خلق سے
(کیوں نہ ہو جدت پسندی کو اِبا تقلید سے
جہل فتوے جس کے کفر و قتل کے دیتا رہا

زندگی بھر تنگ ظرفی سے کیا جس نے نباہ
بے گناہی کے سوا کیا تھا بھلا اس کا گناہ؟
باوجودِ بے نوائی بے محابا، بے پناہ
کوہکنؔ کی جس میں پامردی، یہ وہ پرویز تھا
صاحبِ فرہنگ، اندیشہ سگالے، عاقلے
وہ وفاداری بشرطِ استواری کی مثال
تھے بہم جس میں مذاقِ منطق و ذوقِ جمال

اک خدا آگاہ، روشن فکر مردِ خود گرے
کلک و قرطاس و لبِ اظہار جس کی کائنات
شمع رکھی جس نے روشن فکرِ قرآنی کی تاحینِ حیات
بات اپنے دل کی بیباکی سے لیکن برملا کہتا رہا
جس کے ہونٹوں پر نہ پل بھر کے لئے
کیا دماغِ نکتہ پرور کور مغزوں سے ڈرے؟)
کشتیِ عمرِ رواں جو بحرِ ہیبت ناک میں کھیتا رہا
قرضِ مرگِ ناگہاں سے روز جو نقدِ نفس لیتا رہا

اک زمانہ جس کے عزم و استقامت کا گواہ
تھی بقولِ محرماں اس کو نہ حرصِ مال و جاہ
کچھ نہ رکھتا تھا وہ اقبالی قلندر
جُزدوحرفِ لاالٰہ
اور اسی باعث تھی شیرینؔ خرد اس پر فدا
کہتے تھے جس کے عقیدت مند ''بابا جی'' اُسے
عمر بھر کی بے قراری کا ثمر جس کا کمال
آگہی کی اِک فروزاں شمع تھی جو بجھ گئی
آہ بیدردی تری! اے زندگی! اے زندگی!

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ووٹ کس کو دیا جائے؟

شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) کا نامور مصنف بریفو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے کہ:

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ طاقت ور ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے' اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے۔ یہ انکشاف آج کا نہیں' بہت پرانا ہے کہ انسانی اقتدار بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوت انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مطلق قوت اسے بالکلیہ تباہ کر دیتی ہے۔ نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی' دولت و حشمت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی' کسی افسر کی ہو یا حاکم کی' کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے اور ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت' محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر' اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

دورِ حاضر کے جمہوری نظام میں بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر یہ اقتدار قانون سازی کے اختیار کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ قوانین جنہیں محض اس لئے صحیح اور جائز قرار دیا جاتا ہے کہ انہیں اکثریت نے وضع کیا ہے۔ ان قوانین کو قوت کے زور پر منوایا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ صحیح انسانیت ساز نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں انسانوں کو قانون سازی کے مطلق اختیارات حاصل نہ ہوں۔ لیکن انسانی فکر اس قسم کا کوئی نظام نہ وضع کر سکی ہے نہ کر سکتی ہے' نہ کر سکے گی۔ اس قسم کا نظام صرف وحی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ وہ وحی جس نے بتایا کہ قوانین سازی کے اصول اور حدود خدا کی طرف سے متعین شدہ ہیں جن میں کوئی انسان' کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ ہر زمانے کے انسان باہمی مشاورت سے یہ طے کریں گے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' ہم اپنا نظامِ تمدن کس قسم کا متعین اور متشکل کریں۔ یہ حدود و اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو تمدنی احکام و قوانین وضع کئے جائیں گے ان میں حالات کے تقاضے کے مطابق ردوبدل ہوتا رہے گا۔ یہ اصول و حدود قرآن کریم کے اندر درج اور محفوظ ہیں۔ ہر دور کے انسان باہمی مشاورت سے' ان حدود کے اندر

رہتے ہوئے جزئی قوانین خود وضع کریں گے۔ مشاورت کی مشینری کس قسم کی ہوگی۔ اسے بھی اس نے خود متعین نہیں کیا۔ اسے انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ طریق تھا جس کے مطابق اسلام کے صدر اول میں ایسا نظام تمدن قائم ہوا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار نہیں رکھتا تھا۔ جس میں نہ کوئی حاکم تھا نہ محکوم۔ وہ سب' اصول و اقدار خداوندی کے تابع اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کامل آزادی کی زندگی بسر کرتے تھی۔ چشم فلک نے اس جیسا دور پھر کبھی نہیں دیکھا۔ مملکت پاکستان کا مطالبہ اور حصول پھر سے اسی قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم نے یہ مقصد اور منتہیٰ فراموش کر دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب اس مقصد اور منتہیٰ کو فراموش کر دیا تو لامحالہ ہمیں بھی انسانوں کا وضع کردہ نظام تمدن ہی اختیار کرنا تھا۔ یہ نظام تمدن وہ ہے جسے مغرب کا جمہوری نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے برسرحق ہونے کی ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ یہ نظام اب دنیا میں عام طور پر رائج ہے اور اقوام مغرب کا پسندیدہ۔ وائے برحال ما کہ ہمارے ہاں کے اقامت دین کے مدعی بھی اس نظام کی مدح وستائش میں رطب اللسان ہیں۔ وہ اسے عین مطابق اسلام قرار دیتے ہیں۔

اس جمہوری نظام کی مشینری کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ایک متعین وقفہ کے بعد ملک میں عام انتخابات کئے جائیں۔ یہ طرز انتخاب بجائے خویش مغربی نظام جمہوریت کی ناکامی کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس طرز کے نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ انتخابات کے سلسلے میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ انتخابات منصفانہ ہونے چاہئیں' ان میں دھاندلی نہیں ہونی چاہئے' اس سے زیادہ مطالبہ کوئی نہیں کیا جاتا۔ اس بنیادی کمزوری کو آپ ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کے حلقۂ انتخاب کا ایک چھٹا ہوا بدمعاش بطور امیدوار کھڑا ہو جاتا ہے۔ انتخابات بالکل منصفانہ ہوتے ہیں لیکن وہ اس کا انتظام کر لیتا ہے کہ اکاون فیصد ووٹ اس کے حق میں ڈالے جائیں۔ چنانچہ وہ قاعدے اور قانون کے عین مطابق بغیر کسی دھاندلی کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا آپ اسے اپنا نمائندہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے؟ لیکن سوال آپ کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا نہیں' قانون کی رو سے آپ کو اسے اپنے حلقہ کا نمائندہ تسلیم کرنا ہوگا۔ اب آگے بڑھئے۔ فرض کیجئے کہ اسمبلی میں ایسے لوگ اکثریت حاصل کر لیتے ہیں جنہیں آپ بطیب خاطر اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن وہ اپنی اپنی مدت رکنیت کے دوران جس قدر فیصلے کریں گے' انہیں آپ کو تسلیم کرنا ہو گا۔ خواہ وہ فیصلے کسی قسم کے ہوں۔ ملک کی بڑی سے بڑی عدالت بھی صرف یہ دیکھے گی کہ ان کے یہ فیصلے (یعنی ان کے وضع کردہ قوانین) آئینِ مملکت کی شرائط پوری کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ان شرائط پر پورے اترتے ہوں تو عدالت عالیہ تک کو بھی انہیں مسترد کر دینا تو ایک طرف ان میں کسی قسم کے ردوبدل کا بھی حق حاصل نہیں ہوگا۔ یعنی ان لوگوں کے فیصلوں کے خلاف آپ کی کوئی اپیل بھی قابل قبول قرار نہیں پائے گی۔ یہ ہے موجودہ نظام جمہوریت۔ ہم نے اپنے ہاں آئینی طور پر اس نظام کو قبول اور نافذ کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ کہیں گے کہ اسے بدلنے کا تو ہمیں حق حاصل نہیں۔ لہٰذا ان حالات میں ہم اس کے مطابق عمل درآمد پر مجبور ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو ایک اختیار تو بہرحال حاصل ہے جسے کوئی آئین اور کوئی قانون

آپ سے چھین نہیں سکتا۔ یعنی یہ اختیار کہ آپ اس شخص کو ووٹ دیں جس کی صداقت، شرافت، امانت، دیانت اور اہلیت پر آپ کو پورا پورا بھروسہ ہو۔ ایسے شخص کے تولنے اور ماپنے کے لئے قرآن کریم نے ایک ایسا پیمانہ عطا کر دیا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے مخالفین نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو آپ نے (قرآن کی شہادت کے مطابق) فرمایا کہ:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ (10:16)

میں کوئی اجنبی یا نووارد نہیں، میں نے تم میں اس سے پہلے اپنی پوری عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس پر غور کر کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔

اس میں من قبلہٖ کا ٹکڑا بڑا بنیادی ہے۔ جب کوئی شخص کسی منصب کے لئے آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنی وضع کو بڑا مقدس بنالیتا ہے لیکن اس کا صحیح کیریکٹر اس کی اس زمانے کی زندگی سے سامنے آ سکتا ہے جب وہ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ بس یہ ہے صحیح پیمانہ۔ جو شخص بطور امیدوار کھڑا ہو، آپ یہ دیکھئے کہ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی گذری ہے۔ اس سے آپ اس کے کیریکٹر کا اندازہ لگا لیجئے اور اگر وہ صحیح معیار پر پورا اترے تو پھر اس کے حق میں ووٹ دیجئے۔

یہاں تک تو اس امیدوار کے صرف انسان ہونے تک کی بات تھی۔ اگر آپ اسے اسلام کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہئے کہ وہ اس کا اعلان کرے اگر مجلس قانون ساز میں کوئی معاملہ ایسا پیش آ گیا جو قرآن مجید کے خلاف ہو تو میں اس کی اعلانیہ مخالفت کروں گا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو جن لوگوں نے مجھے ووٹ دیا ہوگا انہیں اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ مجھ سے رکنیت سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کریں۔ اس اعلان سے وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ کہلا سکے گا۔ آپ اس قسم کے نمائندوں کو اکثریت کے ساتھ اسمبلیوں میں بھیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان اسمبلیوں کی ایک ہی مدتِ حیات میں معاشرہ میں کس قدر خوشگوار انقلاب آ جاتا ہے۔

جہاں تک تحریک طلوع اسلام کا تعلق ہے، ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ نہ ہماری اپنی کوئی سیاسی پارٹی ہے، نہ ہم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر بزم طلوع اسلام کا کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہے تو اسے بزم کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ بزم کا رکن البتہ اپنی ذاتی حیثیت سے آزاد امیدوار کے طور پر اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس اسمبلی میں کوئی مسئلہ ایسا سامنے آئے گا جو قرآن مجید کے خلاف ہوگا تو وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ انتخابات ۱۰ اکتوبر کو ہوں گے۔ اس دوران میں ظاہر ہے کہ ملک انتخابی سرگرمیوں کے بحران میں مبتلا ہوگا۔ لیکن طلوع اسلام کی بزموں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کسی ہنگامہ میں حصہ نہ لیں۔ اپنی صوابدید کے مطابق بہترین امیدوار کے حق میں ووٹ دیں، اور نہایت ہی خاموشی اور سکون سے، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے پروگرام پر عمل پیرا رہیں۔ یہ سب ہنگامے رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے اور آخر الامر سربلندی قرآن ہی کے پیغام کو نصیب ہوگی۔ (پرویز علیہ الرحمۃ کی تحریروں سے ماخوذ)

پمفلٹس — PAMPHLETS

ادارہ طلوعِ اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور فون نمبرز: +92 42 3571 4546, +92 310 4800 818
+92 318 4271 465, +92 331 4763 936

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ

محشرستانِ فلسطین

(نوشتہ 1967ء)

پس منظر:

(اسرائیلی حکومت مئی 1948ء میں وجود میں آئی تھی اور طلوعِ اسلام نے جون 1948ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس میں اس کش مکش کے پس منظر کو پوری صراحت کے ساتھ واضح کیا تھا۔ حالات آگے بڑھتے گئے تو ہم نے اپنی اشاعت بابت فروری 1967ء میں اسے دہرایا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس المیہ جانگداز و جگر سوز کے متعلق لکھتے رہے۔ اب جو اس مسئلہ نے اندوہ ناک صورت اختیار کی ہے تو ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اس قضیۂ ماضی کو سامنے لایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس مفسدہ انگیزی اور خونریزی کی اصل کیا ہے۔ اس بناء پر ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کی ابتداء اس تشریحی مقالہ سے کی جائے جو 1967ء میں شائع ہوا تھا اور جو بڑا معلومات افزا تھا۔ اس ماضی کی داستان سے حال کی حشر انگیزی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی)۔

اہلِ فلسطین، خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دو چار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر سکے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی اُلجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشۂ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روشن ہو جائے گا کہ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

بین الاقوامی جنگاہ:

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیاء تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیاء، جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا

گمان تک بھی نہ تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصہ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر فلسطین۔ معلوم دنیا میں قومیں اُبھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، وادیٔ سندھ، اسیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما! ان اقوام کے عروج وزوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑے کو بے دردی سے روند ڈالتے رہے۔ اس کے حسیات ومطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دیئے جاتے۔ فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا، کہ وہ اس کا حلیف ہو یا اُس کا حریف، وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین، بین الاقوامی، تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا اور جنگ کے زمانہ میں عساکر وجیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہوجاتا۔ اس کی قومی آزادی وخودمختاری ناقابلِ حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے فلسطین کسی ایک طرف ہوکر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہلِ فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کردیتی۔ لیکن یہ اہمیت خطرناک تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

آلِ اسرائیل:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ (Juda) میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔۔۔ آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم وتکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے، پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعونِ مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت وکثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کردیں۔ اس لئے اس نے اُنہیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ ''بنی اسرائیل کی قوت کی روک تھام کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کردیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔'' یعنی ان میں کے ایسے لوگوں جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہو، کچل دیا جائے، اور غلامانہ صفت لوگوں کو آگے بڑھایا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام، کہ آلِ اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اسی عالم میں مصر کے دارالسلطنت میں پیدا ہوئے۔ مشیت ایزدی نے آلِ اسرائیل کے اس فرزند کی پرورش کا سامان شاہی محلات میں کردیا اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں

آزاد تربیت دی۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جوشوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور قدیم باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مؤرخین اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ قدیمی باشندے بالکلیہ نیست و نابود ہو گئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے۔ بلکہ مفتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب (The Outline of History) میں لکھا ہے:

> یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین (The Promised Land) کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلافِ واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ (Philistines) جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمال میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

اسرائیلی، شبانی اور زرعی زندگی کے عادی تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکانِ زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے موجودہ خصائل ___ شہروں میں بسنا، مالیات و تجارت میں مہارت وغیرہ ___ ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی خونریزی کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی معمار حضرت سلیمان علیہ السلام کے تزک و احتشام کے باوجود عہد نامہ عتیق کی داستان، مکانات اور محلات کے بجائے گیہوں، انگور، زیتون، بھیڑوں اور بیلوں کی داستان کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام ''شبان'' (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام، آلِ اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے پہلی بار گیارہویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے دسویں صدی میں بیت القدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں ''سلطنتِ اسرائیل'' کو قائم کیا۔ باقی دو یعنی جوڈہ اور بن یامین کے قبائل بدستور جنوب میں تختِ داؤد کے وفادار رہے۔

تباہی کی داستان:

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان ہر دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (17:4)

''اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے''۔

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ کوئی 721 ق۔م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے۔ تاریخ ان کے انجام کے معمہ کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی ایک سو سال بعد، بابل کے شاہ بخت نصر نے ''جنوبی حکومت'' کو تہ و بالا کر دیا۔ یروشلم کی، کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا، اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ قتل و غارت گری سلب و نہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخِ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت تباہ ہوئی، بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہوگئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آسکتی ہیں سب یکجا ہوگئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودیوں کے انبیاء علیہم السلام ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہِ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا، جب ساٹھ سال کے بعد سائبرس نے دریائے فرات اور بحرِ روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا اور یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ یا شاہانِ فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ 537 سے 515 ق۔م کے دوران ہیکل پھر تعمیر ہوگیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہوگئی اور وہ اسی نہجِ زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیرِ اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے 332 ق۔م میں اس پر ضربِ کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کا ملاً مسلوب کر لی 3200 ق۔م میں بطلیموس (Ptolmy) نے مصر کے راستے حملہ کیا۔ اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔ حتیٰ کہ 66 ق۔م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہوگئی، جن کا ذکر صحفِ یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے، پاسپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں تقریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہوگئے۔ 51 ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے۔ اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آ گیا۔ رومیوں نے 70ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد یہ قوم دشت پیمائیوں اور صحرانوردیوں میں ذلیل و خوار رہی۔ ''قبل مسیح''، بعد مسیح میں بدل گیا۔ لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ

ہوئی۔۔۔135ء میں شاہ ہیڈرین (Hadrian) نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چار دانگ عالم بکھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں:

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہو گئے وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً، قطرہ قطرہ، فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔ ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ، یادِ وطن تھی اور ایک حد تک' یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہودہ (Jehorah) نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ ''دشمن'' کی فتوحات اور اپنی شکستیں ''تقدیر'' کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے ''وطن'' مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال (Passover) کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے رہے کہ ''آئندہ سال یروشلم میں۔''

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساخت ہیں۔ انہوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ وہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد ارضِ مقدس وموعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابلِ ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھ سے لکھے جا چکے تھے۔ انہوں نے نہ کلچر کو ترقی دی، نہ تہذیب وتمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور تشخص قومی کا دور مختصر اور نا قابلِ رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی، اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے، کوئی نہ کوئی غارت گر آ پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہِ فارس سائرس نے ہر چند انہیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دے دی لیکن اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا اور ذلت ومسکنت کی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان ومکان کے پاس یہودیوں کے ظلم واستبداد کے سوا کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر اقوام کا تختۂ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دَورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت مسیح علیہ السلام یہودی تھے اور ان کے اولیں حواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنانِ مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگڑ خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت وحقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے سوا کوئی راہِ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پئیس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ قومی سزا اس کی ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلابِ فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا اور خیالات ونظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ 1789ء یہودیانِ یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں روس کے سوا ہر جگہ ان

پر سے پابندیاں ہٹادی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے، گاڑیوں میں سفر کر سکتے تھے، زمین کے مالک بن سکتے تھے اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادانہ کام کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو، جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ نفرت ضرور پائی جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے، وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدّیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین، جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا۔ اور اس احساس تقدس کا مظہر وہ (Passover) کی سالانہ ضیافت تھی۔ جہاں ''آئندہ سال یروشلم میں'' کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس اُمید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان (Temple of Soloman) کی از سرِ نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ ہیکل سلیمان کی جگہ، مسجدِ عمرؓ استوار ہے۔ ایک کی تعمیر، دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں ''تبدیلی'' نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ سلک مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیر مسجد غصب ہے وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس نزاع خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد:

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے عہد میں، یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد 636ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لے کر 1917ء تک کہ جنرل ایلن بی نے ترکوں سے اسے فتح کر لیا۔ سوائے اس عرصہ کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت قائم کی، فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں عربی قوت وشوکت ان کی قبائلی عصبیت لہٰذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارہویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے۔ اور خلیفۂ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انہوں نے 1917ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے 1075ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوتِ مقدس کو تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی۔ تاکہ ''کافر'' ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد 1099ء میں، پاپائیانِ یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اُسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت وخون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوؤں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ 1100ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ 1169ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قویٰ کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ 1187ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ

برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی دور کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے۔ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آسکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانی کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ازاں بعد ترکانِ عثمانی اُٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہوگئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا تک کو فتح کرلیا۔ 1453ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کردیا گیا جس کا الغا 1923ء میں مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ 1917ء میں جنرل ایلن بی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

صیہونیت:

جیسا کہ لکھا جاچکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بے چارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر ناگزیز تھا کہ تمام قوتیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربی کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہوگئے اور اس طرح ''نئی آبادیوں'' کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تھی بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جاسکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیراتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترکِ وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دوسرے سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالم گیر یہودی جدوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہودیوں کا تناسبِ آبادی بمشکل پانچ فی صد تھا جو پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز تک سات فی صد سے زیادہ نہ ہوسکا۔ اختتام جنگ پر 1919ء میں یہ تناسب دس فی صد تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشہ صرف کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اوّل تک مکمل عربی ملک تھا۔ کیونکہ عرب آبادی نوے فی صد تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ 1881ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی چاروناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکینِ وطن کی حقیر سی تعداد عازم فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن ''محبانِ صیہون'' (Choveve Zion) قائم ہوئی جس نے یہودی تارکینِ وطن کا رُخ سوئے فلسطین پھیرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ 1897ء میں ایک آسٹروی صحافی (Theodor Herzl) نے صیہونی سوسائٹی (Zionist Society) قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی اسٹیٹ میں اکٹھے ہوجائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی اسٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ 1903ء میں جب برطانوی حکومت نے یوگنڈا (Uganda) کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول

کرلیا۔ البتہ جب یہ پیش کش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کردی۔ اس وقت ہرزل کا انتقال ہو چکا تھا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق:

فلسطین پر یہودی استحقاق بتایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدت کے لئے حکمراں رہے۔ اس زمانۂ اقتدار میں ہر چند انہوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کرسکے فلسطین سے ختم نہ کرسکے، نہ اکھاڑ پھینک سکے۔ اس مختصر دورِ حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و مسکنت اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کرسکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہوسکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے۔ تاریخ وسیاست اوّل الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہدِ ماضی میں وہ اس پر فرمانروا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیلِ بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حقِ ملکیت کے حق میں دی جاسکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہئے، نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمران رہے ہوں، یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوئے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے جائز مالک ہیں۔ لیکن عربوں کے حق میں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں ہیں اور اس کے بدستور مالک ہیں ان کے ہاں انتقالِ ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک فلسطین سے یہودیوں کی جذباتی وابستگی اور ''آئندہ سال یروشلم میں'' کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسمِ کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے ہیں وہ 'وہ' ہیں جنہیں اُن کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے اور جنہیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کرکے فلسطین کی جانب بھیجا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترکِ وطن کرکے فلسطین میں نہیں آجاتے؟ کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنہوں نے فلسطین میں پناہ لی، کم ایمان دار یہودی ہیں؟ بات صاف ہے۔ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم وتعدی نہیں ہورہا، اس لئے ''آئندہ سال یروشلم میں'' دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں آکر آباد نہیں ہوئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہیں، بلکہ خصوصی اغراض ومصالح سے انہیں عرب مظلومین پر ٹھونسا جارہا ہے اور عربوں کو آبائی وطنوں سے نکالا جارہا ہے۔ اس طرح ان بدبختوں کے لئے اور مصیبت پیدا کی جارہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ٹھونسنا، حملہ کرنے کے مترادف ہے۔

(جاری ہے)



سفرِ آخرت

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
2

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

